خوشونت سنگھ
نہرو خاندان پر لکھا جانے والا انکشاف انگیز اور متنازعہ ترین ناول
سمندر میں تدفین
Burial at Sea

Ebook By
Anis ul Hassah Shah

https://web.facebook.com/Shah.AnisulHassan/

https://wa.me/message/923142893816

فہرست

سمندر میں تدفین

❁ ❁ ❁
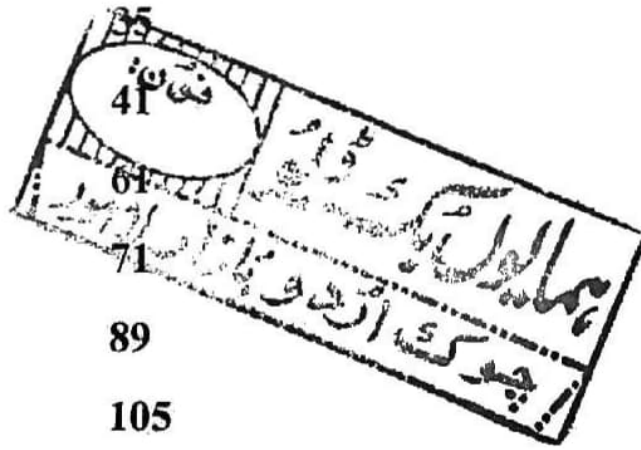
''سمندر میں تدفین'' پر ایک نظر

خوش ونت سنگھ برصغیر کے ایک ایسے ادیب ہیں' جن کے قلم کی کاٹ سے عام قاری خوب لذت و مسرت حاصل کرتے ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں اس حرماں نصیب خطے کی تقدیر کے مالک طبقۂ اشرافیہ کے افراد کے رازہائے درونِ خانہ طشت از بام کرتے ہیں۔ خوش ونت سنگھ نے کچھ ماہ پہلے ''بھارت کا خاتمہ'' (The End Of India) کے عنوان سے ہندوستانی ''فنڈوز'' ...... ہندو بنیاد پرستوں ...... کی مکروہ اور انسان دشمن وحشیانہ کارروائیوں پر شدید تنقید کرکے روشن خیال لوگوں کے جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی کی تھی۔ اب اپنے تازہ ترین ناول ''سمندر میں تدفین'' (Burial At Sea) میں انہوں نے سیکولر بھارت کی سب سے نمایاں علامت نہرو اور اندرا گاندھی کی اب تک پردۂ اخفا میں رکھی گئی جنسی بے راہرویوں کو کہانی کے روپ میں نہایت مؤثر اور دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ یہ خوش ونت سنگھ جیسے ادیب ہی کا حوصلہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں رہتے ہوئے نہرو خاندان کی سیاہ تاریخ کو عام قارئین کے لیے لفظوں کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس سے قبل انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری ''سچ محبت اور ذرا سا کینہ'' میں اندرا گاندھی اور اس کے گھرانے کے اندرونی اختلافات کو تفصیل کے ساتھ لکھا تھا اور ہندوستان کی سیاسی دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

''سمندر میں تدفین'' کا پلاٹ حقیقت پر مبنی ہے۔ خوش ونت سنگھ نے ''دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ'' کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر کے کردار کی کجی اور کمتری کو اس

کمال ہنرمندی سے بیان کیا ہے کہ قاری مسحور ہو کر رہ جائیں گے۔

''نگارشات'' اس ناول کی معنویت اور تاثر میں اضافے کے لیے ہندوستانی جرائد میں شائع ہونے والی کچھ اہم تحریروں کے تراجم بھی ناول کے ساتھ شائع کر رہا ہے۔ امید ہے کہ اس سے قارئین کی ناول میں دلچسپی بڑھ جائے گی۔

اس ناول کے ترجمے کا اعزاز ''نگارشات'' نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مجھے دیا ہے' امید ہے قارئین اس کاوش کو سراہیں گے۔

محمد احسن بٹ

جون 2004ء

کچھ باتیں خوش ونت سنگھ جی کے بارے میں!

سردار خوش ونت سنگھ کو خراج عقیدت پیش کرنا چاہیں تو اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ برصغیر پاک و ہند کا ایک معروف بے باک قلم کار، صحافی، کالم نگار، سیاسی تجزیہ نگار، افسانہ نویس، ناول نگار، حقائق اور سچائی پر مبنی اپنی سرگزشت لکھنے والا بھارت کا بلکہ براعظم ایشیا کا منفرد اور اکلوتا رائٹر ہے۔ انگریزی ادب اور فکشن میں اسے بھارت میں بڑا بلند مقام حاصل ہے۔ اگرچہ پاکستان اور بھارت میں کچھ لوگ اسے ''سیکس کا پجاری'' ...... ''قدیم رسم و رواج کو توڑنے والا'' ...... ''عیش و نشاط کا شوقین'' ...... ''جنسی شیطان'' ...... ''حسین اور خوبصورت عورتوں کے جسموں کا شیدائی'' ...... ''عورت و مرد کے باہمی تعلقات کو ہیجان انگیز الفاظ میں بیان کرنے والا'' اور اس لفاظی سے محظوظ ہونے اور اپنے پڑھنے والوں کو محظوظ کرنے والا جنسی مریض قرار دیتے ہیں لیکن خوش ونت سنگھ لوگوں کی ان باتوں کو سن کر نہ تو برا مانتا اور نہ کسی بات کی کوئی پروا کرتا ہے۔ اس کا کام لکھنا، لکھنا اور صرف لکھنا ہے! پانچ برسوں کی خاموشی کے بعد یہ نیا ناولٹ مارکیٹ میں آیا ہے!

سردار خوش ونت سنگھ کی عمر اس وقت 90 سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔ لوگ اسے کم سے کم برے الفاظ میں یاد کرتے ہیں تو ''گندہ بوڑھا'' کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں۔ اب تک خوش ونت سنگھ کی 109 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ پچھلے دنوں نہرو کی برسی کے موقع پر خوش ونت سنگھ کی 110ویں کتاب ''سمندر میں تدفین'' ...... "Burial At Sea" شائع ہوئی ہے۔

یہ کہنے کو تو محض ایک ناولٹ ہے جس میں خوش ونت کی دوسری کتب کی طرح سیکس کا تڑکہ لگا ہوا ہے لیکن چونکہ اس میں بھارت کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی خفیہ زندگی اور ان کی جنسی کرتوتوں کو اور ان کی سپتری (صاحبزادی) اندرا گاندھی اور ان کے ایک مشیر وید حکیم سوامی جی کی زندگی کے خفیہ گوشوں کو بھی بے نقاب کیا گیا ہے اس لیے یہ کتاب بھارت بھر میں خوب فروخت ہو رہی ہے۔ اب تک اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ کر مارکیٹ میں آ چکے ہیں۔

پنڈت نہرو' سنیاسن شردھا ماتا' اندرا گاندھی' سوامی برہمچاری ناول کے چاروں اہم کرداروں میں سے فی الوقت دنیا میں کوئی موجود نہیں ہے اس لیے ناول میں بیان کیے گئے سیکس سے بھرپور واقعات کی تردید کی جا سکتی ہے نہ تصدیق! لیکن خوش ونت سنگھ جی نے جس خوبصورت انداز میں یہ ناول لکھا ہے اور جس طرح اس میں سیکس کا گرم مصالحہ چھڑکا ہے اس نے کتاب کو اتنا پرکشش بنا دیا ہے کہ خوش ونت کی دوسری کتب کی طرح یہ کتاب بھی ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر رکھی نہیں جا سکتی۔

ناول میں تمام حقیقی کرداروں کے نام تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔

پنڈت نہرو کا کردار ''وکٹر'' جے بھگوان کے نام سے بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ خوش ونت سنگھ اس مخصوص کردار کے سیاسی خاندان کے بارے میں بہت کچھ

جانتا ہے۔ اپنے تازہ انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں خوش ونت سنگھ کہتے ہیں: ''نہرو ہمیشہ اختلافات کے باوجود وہ مہاتما گاندھی سے عقیدت رکھتا تھا اور مہاتما گاندھی بھی نہرو سے بہت پیار کرتے تھے۔ نہرو بظاہر نیک اور شریف تھا لیکن جب اس کے ایک سنیاسن شردھاماتا کے ساتھ ناجائز تعلقات کے بارے میں پتہ چلا تو سب حیران و ششدر رہ گئے۔ اس امر کا انکشاف سب سے پہلے نہرو کے سیکرٹری ایم او میتھائی نے اپنی کتاب ''نہرو دور کی یادیں'' "Reminiscences Of Nehru Age" میں نہایت تفصیل سے کیا ہے۔

خوش ونت سنگھ اپنے تازہ انٹرویو میں کہتے ہیں: ''مجھے شردھاماتا کے بارے میں اس وقت پتہ چلا جب وہ 60 سے زیادہ عمر کی ہو چکی تھیں۔ میں ان سے پہلی بار دہلی کی نگم بدھ گھاٹ (Nigambodh Ghat) میں ملا تھا۔ وہ ایک ٹینٹ میں بیٹھی تھیں۔ ٹینٹ کے باہر ان کا کتا پہرہ دے رہا تھا۔ میرے وہاں پہنچنے پر اس نے بھونکنا شروع کر دیا۔ بعد میں وہ جے پور چلی گئی۔ وہاں میں نے اس کے ساتھ تفصیلی ملاقات کی۔ وہ دیکھنے میں ایک روایتی بھارتی عورت نظر آتی تھی۔ جبکہ نہرو ایسا نہ تھا۔ نہرو کے سیکرٹری نے اپنی کتاب میں واضح اور صاف طور پر لکھا ہے کہ نہرو سے ناجائز تعلقات کے باعث وہ (سنیاسن) نہرو کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ بچہ پیدا ہونے کے بعد کہاں گیا؟

خوش ونت سنگھ کے ایک سوال کے جواب میں سنیاسن شردھاماتا نے کہا: ''جب نہرو نے مجھ سے شادی کرنے کو کہا تو میں نے نہرو سے کہا...... تم برہمن ہو اور میں شاستری۔ ہمارے درمیان ''سمبندھ (ناجائز تعلقات) تو قائم ہو سکتے ہیں مگر ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔'' شردھاماتا کی باتوں میں سچ مچ بہت سچائی تھی۔ وہ اچھے کردار کی دکھائی دیتی تھی — خوش ونت نے بتایا۔

خوش ونت سنگھ کا کہنا ہے کہ نہرو چھپا رستم تھا۔ ایک طرف اس کے تعلقات لیڈی ماؤنٹ بیٹن سے تھے تو دوسری طرف پدمانائیڈو کی زلفوں کا اسیر تھا۔ ایک عرصے تک وہ بھارت کی معروف فلمی اداکارہ ثریا کا بھی دلدار رہا ہے۔ چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ اور کلکتہ ہائی کورٹ کے جج دے۔بی۔سنگھ تیواتیہ نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے پنڈت نہرو اور شردھاماتا کے محبت بھرے خطوط بذاتِ خود دیکھے ہیں جو بعد میں سرکاری طور پر ضائع کردیئے گئے تھے۔"

بھارت کے کثیرالاشاعت جریدے "انڈیا ٹوڈے" کے تبصرہ نگار کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے انکشاف کرتے ہیں:

> "شردھاماتا ایک انڈین ماتاہری تھی جس کو بھارت کی کٹر انتہاپسند جماعت "ہندو مہا سبھا" نے سیکولر نظریات کے حامل پنڈت جواہر لعل نہرو کو ورغلانے کی خاص تربیت دی تھی تاکہ وہ پنڈت نہرو کا سیکولر ذہن اور انڈیا کا سیکولر ویژن تہس نہس کرسکے۔ جب بھارت کی ہوم منسٹری نے پنڈت نہرو سے وضاحت طلب کی تو نہرو نے اپنے وضاحتی جواب میں ہوم ڈیپارٹمنٹ کو لکھا: "یہ سچ ہے کہ وہ عورت (شردھاماتا) تنہائی میں مجھ سے کئی مرتبہ ملی ...... ہم نے ہندو کوڈبل پر بحث کی اور بھارت کی قومی زبان کے سوال پر گفتگو کی۔ اس نے میرے قریب آنے اور اپنے ساتھ ......تعلقات بڑھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکی......"

خوش ونت سنگھ کے دوسرے ناولوں کی طرح اس تازہ ناول میں بھی بے شمار سیکس کو بھڑکانے والے سین ہیں۔ جب کوئی دوست اس جنسی منظرکشی پر اعتراض

کرتا ہے تو خوش ونت کا چاہنے والا اسے غیر مہذب کہہ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتا ہے اور یوں دوسرے اسے ''دفن کرنے'' کی تجویز پیش کر دیتے ہیں۔ اس طرح موجودہ ناول کا نام بوریئل ایٹ سی ''سمندر میں تدفین'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

خوش ونت سنگھ اعتراضات اور نکتہ چینی سے ہمیشہ بے پروا رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے:

''لوگ مجھے جنسی شیطان اور کئی دوسرے حقیر ناموں سے پکارتے ہیں۔ کوئی مجھے معاشرے کو بگاڑنے والا مجرم کہتا ہے۔ میری نگاہ میں یہ سب لغویات ہیں۔ لوگ کھلے عام کہتے ہیں کہ یہ کتنا گندہ بوڑھا ہے جو اس عمر میں بھی سیکس کے بارے میں لکھتا ہے۔ حالانکہ اب تک بھارت میں شائع ہونے والی سب سے بے ہودہ کتاب ''کاما سوترا'' یا ''کام شاستر'' ہے۔ لیکن یہ کتب بھی پاکیزہ اور صاف ستھرے سرورق کے ساتھ شائع کر دی جائیں تو اعلیٰ بھارتی کلچر سمجھ کر قبول کر لی جائیں گی۔ اسی طرح بھارت میں جس طرح کی عریاں مجسمہ سازی' تصویر کشی کی جاتی ہے' مندروں میں جس طرح کی ننگی مورتیں بنی ہوئی ہیں' کھجوراؤ اور کئی دوسرے مندروں میں ننگی عورتیں' ننگے مرد جس طرح باہم لپٹ کر ہم آغوش ہوتے نظر آتے ہیں' عورتوں کے ہاتھ مرد کے نازک خفیہ اعضاء پر اور مرد کے ہاتھ عورتوں کے ستر اور چھاتیوں پر رینگتے دکھائی دیتے ہیں اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ یہ بھارت کا سیکس کلچر ہے۔ لیکن

جب آج کا معروف مسلمان مصور حسین اس طرح کی کوئی پینٹنگ بنا کر پیش کرتا ہے تو اس کی تصاویر بھارتی جلا دیتے ہیں۔ یہ اس ملک کے لوگوں کا دوہرا معیار ہے۔ جو روز بروز ترقی پا رہا ہے۔ میری کتابوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں عریانیت ہوتی ہے' سیکس کا پرچار ہوتا ہے' میری کتابوں پر پابندی کے ساتھ ساتھ پنڈت نہرو کی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' پر بھی پابندی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں یہ فسطائیت نہیں تو اور کیا ہے......!

میں نے آج تک کبھی کسی کی پروا نہیں کی۔ میں ایک قلم کار ہوں' میرا کام ہے لکھنا ...... میں لکھ رہا ہوں۔ دن رات لکھ رہا ہوں۔ کتابیں لکھتا ہوں۔ کالم لکھتا ہوں۔ ناول لکھتا ہوں۔ مختصر کہانیاں لکھتا ہوں۔ جو میرے من میں آتا ہے لکھتا ہوں۔ میں ایک آزاد منش ہوں' میں اپنی مرضی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ لکھنا اور لکھتے رہنا میری عادت اور میری فطرت ہے۔ میں اپنی کامیابی کا غلط دعویٰ نہیں کر رہا۔ میری کتابوں نے سچ مچ کمال دکھایا ہے۔ میرے کالم' میری کتابیں ہر طبقہ میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ میں ایک حقیقت پسند انسان ہوں۔ جو میں کہنا چاہتا ہوں' لکھتا ہوں' چھپواتا ہوں' لوگ ہاتھوں ہاتھ لے کر پڑھتے ہیں۔ ایک بار نہیں بار بار پڑھتے ہیں۔ میرے پڑھنے والے ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہیں' پھر میں کیسے لکھنا بند کر سکتا ہوں۔ اور پھر لکھنا میری روزی روٹی کا مسئلہ

ہے۔ میں کیوں نہ لکھو.....؟"

اس نے بڑے پرجوش انداز میں کہا۔

بزرگی اور عمر رسیدہ ہونے کے باعث اس کی آواز میں نرمی پیدا ہوچکی ہے۔ وہ آہستہ لہجہ میں بات کرتا ہے لیکن اس کے الفاظ میں جوش اور بلا کی کاٹ ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ پچھلے دنوں اس کی نئی کتاب کی رونمائی کی تقریب تھی۔ خوش ونت سنگھ ان لوگوں کے پاس کھڑا تھا جو اسے چڑانے کے لیے بار بار "گندا بوڑھا" (Dirty Oldman) کہہ کر پکار رہے تھے۔ خوش ونت جو بلا کا حاضر جواب ہے کہنے لگا:

"ٹھیک ہے میں ایک گندہ انسان ہوں۔ سردیوں میں میں روزانہ غسل نہیں کرتا۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ مجھے گندہ کس لیے کہتے ہیں۔ آپ لوگ اصل میں مجھے بتانا چاہتے ہیں کہ میں ایک گندہ (سیکس پر لکھنے والا) بوڑھا ہوں۔ میرا ذہن گندہ ہے' میں آپ کی باتوں پر اس لیے برا نہیں مانتا۔ چونکہ میں اتنی عمر میں بھی اپنا "ذہن" استعمال کرتا ہوں اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں جب کوئی انسان "کچھ استعمال" کرتا ہے تو لازمی امر ہے کہ وہ چیز زیادہ اور بار بار استعمال کرنے سے گندی ہوجاتی ہے! میں آپ لوگوں کی مسلسل نکتہ چینی اور اعتراضات سے ہرگز پریشان نہیں ہوتا۔ اور میں اس بات پر مکمل یقین رکھتا ہوں کہ دنیا میں ہر شخص لکھنے پڑھنے' کہنے سننے میں آزاد ہے۔ میں اسی آزادی پر یقین رکھتا ہوں۔ اس نے آخر میں آسکر وائلڈ (Oscar Wilde) کا حوالہ دیتے ہوئے

"When I am dead let it be said his sins were

scarlet but his books, were read."

اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''میں ایک برا انسان ہوں۔ برا لکھتا ہوں۔ لیکن میرا لکھا بہت شوق اور ذوق سے پڑھا جاتا ہے۔ میری کتب خوب فروخت ہوتی ہیں۔''

''میں مر جاؤں گا لوگ مجھے پھر بھی برا کہتے رہیں گے لیکن میری کتابیں اسی ذوق شوق کے ساتھ پڑھتے رہیں گے......!''

قارئین باتمکین جیسا کہ ہم اس مضمون کے آغاز میں عرض کر چکے ہیں کہ خوش ونت سنگھ ایک بے باک' آزاد منش اور نڈر انسان ہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں کسی جھجک' خوف اور ڈر کے بغیر لکھتے ہیں اور کسی سے جو کہنا ہوتا ہے وہ اس کے منہ پر کہتے ہیں۔ یہی ان کی مردوں والی خوبی ہے اسی خصوصیت کے باعث لوگ ان کی ہر تحریر اور ان کے تبصروں اور تجزیوں کو ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔

آخر میں ہم یہاں پاکستان کے معروف صحافی' جیو ٹی وی کے ممتاز تبصرہ نگار اور پاکستان کے کثیرالاشاعت اخبار روزنامہ جنگ کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے کالم نگار برادرم حامد میر کے تازہ ترین کالم (24 مئی 2004ء) کی چند سطور' جو موصوف نے خوش ونت سنگھ جی کے بارے میں لکھی ہیں' پیش کرکے آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔

جناب حامد میر مسٹر خوش ونت سنگھ سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خوش ونت سنگھ کو آج بھی وہ دن یاد ہے جب کانگریسی غنڈوں نے نئی دہلی میں ان کے گھر پر حملہ کردیا تھا اور وہ بڑی

مشکل سے جان بچا کر گھر سے بھاگے تھے۔ نومبر 2003ء کی ایک صبح خوش ونت سنگھ نئی دہلی میں اپنے گھر کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں مجھے 1984ء کے ہندو سکھ فسادات کی کہانیاں سنا رہے تھے۔ انہوں نے بڑے سنجیدہ انداز میں کہا کہ: ''تم مسلمان اپنے دشمن کو بہت جلدی بھول جاتے ہو اور آسانی سے معاف بھی کر دیتے ہو لیکن ہم سکھ اپنے دشمن کو بڑی مشکل سے معاف کرتے ہیں اور ہم کبھی نہیں بھولیں گے کہ ہمارے متبرک دربار صاحب امرتسر پر گولیاں کانگریسی غنڈوں نے چلائیں اور جب اس ظلم کے خلاف سکھوں نے احتجاج کیا تو دہلی میں کانگریسی غنڈوں نے سکھوں کو گھروں سے زبردستی نکال نکال کر مار ڈالا' بے دردی سے قتل کیا' ان کے گھروں کو لوٹ کر نذر آتش کیا۔ یاد رکھنا یہ بی جے پی (بھارتیہ جنتا پارٹی) والے ہندو انتہاپسند ضرور ہیں لیکن جو ان کے دل میں ہے وہی ان کی زبان پر ہے جبکہ آئی سی پی (انڈین کانگریس پارٹی) والے اندر سے کٹر (انتہاپسند) ہندو اور باہر سے سیکولر ہیں۔''

اس مرحلے پر مفکر خوش ونت سنگھ نے اپنے ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں پر لٹکے ہوئے پردوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ان پر ''السلام علیکم'' لکھا ہوا ہے۔ بی جے پی والے ان پردوں پر اعتراض کریں تو مجھے دکھ نہیں ہوتا لیکن جب ایک مسلم دوست ہندو کانگریسی لیڈر نے ''السلام علیکم'' پر اعتراض کیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ مہاتما گاندھی کے ہندوستان میں سیکولرازم

کا کوئی مستقبل نہیں! خوش ونت سنگھ نے ہندوستان کی صحافت اور سیاست کے میدان میں نصف صدی گزار دی ہے اور یہ نصف صدی کا تجربہ تھا کہ انہوں نے انتخابات سے چھ ماہ قبل ہی اس ملاقات میں مجھ سے کہا تھا کہ اگر کبھی کانگریس کو اکثریت مل گئی تو یہ ہندو لیڈر سونیا گاندھی کو وزیراعظم ہرگز نہیں بننے دیں گے۔ خوش ونت سنگھ کا یہ دعویٰ مجھ ناچیز کے لیے ناقابل یقین تھا۔

میں نے خوش ونت سنگھ جی سے پوچھا: ''آخر سونیا گاندھی کو بھارت کا وزیراعظم کیوں نہیں بننے دیا جائے گا؟''

دانشور خوش ونت سنگھ نے اپنی بے ترتیب داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا: ''کیوں کہ وہ ہندو نہیں ہے۔ وہ اندر سے سیکولر ہے۔ بھارت کے سارے لیڈر باہر باہر سے سیکولر ہیں۔ (اندر سے انتہاپسند ہندو ہیں) میری یہ بات یاد رکھیں اگر سونیا گاندھی وزیراعظم نہ بن سکی تو پھر میری نئی کتاب ''اینڈ آف انڈیا'' (End Of India) (بھارت کا خاتمہ) واقعی میں حقیقت بن جائے گی۔ مہاتما گاندھی کا ہندوستان باقی نہیں رہے گا؟''

خوش ونت سنگھ سے ملاقات کے اگلے روز نئی دہلی کے اشوکا ہوٹل میں من موہن سنگھ جی سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے خوش ونت سنگھ کا نام لیے بغیر ان سے پوچھا کہ اگر کانگریس جیت گئی تو بھارت کے دانشوروں کا کہنا ہے کہ یہاں کے لیڈر انہیں کبھی

وزیراعظم کے طور پر قبول نہیں کریں گے؟

موجودہ وزیراعظم من موہن سنگھ نے دھیمے لہجہ میں ہنستے ہوئے کہا کہ آپ کا سوال محض ایک مفروضہ ہے۔ سچ پوچھئے تو کانگریس کو سونیا نے ہی بچایا ہے۔ اب وہی اسے چلائیں گی۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ سونیا گاندھی کے علاوہ کوئی دوسرا کانگریسی وزیراعظم بن سکتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ یہ تو ہماری شکست ہوگی۔ ہم ختم ہوجائیں گے۔ میرے اور من موہن سنگھ کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کو اس وقت کے نائب وزیرخارجہ فلمسٹار ونود کھنہ بھی سن رہے تھے۔ انہوں نے من موہن کی بات سن کر پنجابی میں کہا: ''سردار جی! ہم الیکشن بھلے ہار جائیں لیکن تمہاری غیرملکی لیڈر سونیا گاندھی کو بھارت کا وزیراعظم کبھی نہیں بننے دیں گے۔''

ہفتہ 23 مئی 2004ء کو من موہن سنگھ نے سونیا گاندھی کی جگہ بھارت کے نئے وزیراعظم کا حلف اٹھایا۔ اس دن مجھے خوش ونت سنگھ جی بہت یاد آئے۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں نے انہیں نئی دہلی فون بھی کیا لیکن افسوس طبیعت کی خرابی کے باعث بھارت کا یہ نڈر، بے باک دانشور گفتگو نہ کرسکا......''

غالباً وہ ''سیکولر بھارت کے خاتمہ'' پر اندر ہی اندر سسک رہا ہوگا!

مقبول احمد دہلوی

24 مئی 2004ء

''اگر میں سنیاسن نہ ہوتی'
تو نہرو مجھ سے شادی کر لیتا''

ایک خوب صورت وزیراعظم' ایک دلکش سادھوی اور
ایک مُردہ پیدا ہونے والا بچہ!

تحقیق: شیلا ریڈی

اپریل 1949ء کے ایک دن بنگلور کے کینٹ سٹیشن کے نزدیک واقع ایک ہسپتال میں کام کرنے والی لیڈی ڈاکٹر ایزیکیل کو ایک حاملہ عورت پر بہت ترس آیا۔ اس عورت کو اپنا نام اور پتا نہ بتانے پر ہسپتال سے نکال دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ایزیکیل کو اس عورت کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ شمالی ہندوستان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ آسودہ حال دکھائی دیتی تھی' یہ الگ بات ہے کہ اس کے پاس بہت کم پیسے

تھے۔ ڈاکٹر ایزیکیل کو اس تیس بتیس سالہ عورت پر اتنا ترس آیا کہ اس نے بینسن ٹاؤن میں اس کے لیے ایک چھوٹا سا مکان 50 روپے ماہانہ کرائے پر لیا' اس کے لیے کھانے پینے کی اشیا خریدیں' دھوبی کا بندوبست کیا اور اسے دن میں دو مرتبہ ٹیکسی پر سول سٹیشن کے رومن کیتھولک ہسپتال معائنے کے لیے لے جانے لگی۔

جلد ماں بن جانے والی اس عورت نے بنگلور میں ایک مہینہ ان خطوں کو بار بار پڑھتے ہوئے گزارا' جنہیں وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتی تھی۔ جب وہ سوتی تو خطوں کا پیکٹ اپنے سرہانے تلے رکھ لیتی۔ 30 رمئی 1949ء کو اسے بچے کو جنم دینے کے لیے ہسپتال لے جایا گیا۔ اس نے اسی رات ایک مردہ بچے کو جنم دیا۔ وہ ہسپتال میں نو دن رہی۔ اس کے بعد اسے کرائے والے مکان میں لے آیا گیا' جہاں وہ دس دن رہی۔ آخر 19 رجون کو وہ ہوائی جہاز کے ذریعے دہلی چلی گئی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے ڈاکٹر ایزیکیل سے وعدہ کیا کہ وہ اس کا 600 روپے کا قرض جلد ادا کردے گی۔

تاہم وہ واپسی کے وقت اپنے خطوں کو لے جانا بھول گئی۔ وہ خط ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے تھے' جو اس نے اس عورت کو لکھے تھے۔ وہ شردھا ماتا تھی ـــ ایک نوجوان دلکش سنیاسن' جس پر نہرو لٹو ہو چکا تھا۔ اس سنیاسن کے ایک دوست' دیبی سنگھ تیواتیہ نے' جو کہ پنجاب اور کلکتہ کی ہائی کورٹوں کے ریٹائرڈ چیف جسٹس ہیں' راقم الحروف کو نہرو اور شردھا ماتا کے تعلق کی ساری داستان سنائی۔

ڈاکٹر ایزیکیل نے شردھا ماتا کے بارے میں دوبارہ کبھی نہیں سنا۔ حد تو یہ ہے کہ جب اس نے شردھا ماتا کو اس کے دیئے ہوئے پتے ـــ معرفت اسوتوش لہری' جی ایس ایچ ایم ایس' نیو دہلی ـــ پر خط بھیجا تو خط جوں کا توں واپس آ گیا۔ ڈاکٹر

ایزیکیل کے خاوند نے اپنے ایک دوست ہندی سکالر ڈاکٹر کرم چند وید سے مدد مانگی۔ ایزیکیل نے اس کے کوائف جاننے کے لیے ان خطوں کو پڑھوایا' جنہیں وہ ہر وقت اپنے پاس رکھتی تھی لیکن جاتے وقت اپنے سرہانے تلے ہی بھول گئی تھی۔

وید نے پہلا خط' جو کہ 2مارچ 1948ء کو گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ سے بھیجا گیا تھا' دیکھتے ہی پنڈت نہرو کی ہینڈ رائٹنگ کو پہچان لیا۔ دوسرے خط بھی نہرو کے تھے' جو شردھا کے نام لکھے گئے تھے۔ وید نہرو کا پرجوش مداح تھا۔ وہ ان خطوں سے اس کی ساکھ کو پہنچنے والے ممکنہ نقصان کے حوالے سے فکرمند ہوگیا۔

اس نے شردھا کا قرض چکایا اور ڈاکٹر ایزیکیل کو 600 روپے ادا کر کے خط اپنے پاس رکھ لیے۔ وہ ان خطوں کو ذاتی طور پر نہرو تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے نہرو کے پرائیویٹ سیکرٹری اے۔وٹھل پائی کو خط لکھا لیکن پائی نے حوصلہ افزا جواب نہ دیا۔ پائی نے لکھا تھا کہ اس کا اور وزیراعظم کا خیال ہے کہ وید کو خط پہنچانے کے لیے دہلی آنے کا خرچ برداشت کرنا اور سفر کی تکلیف نہیں سہنا چاہیے۔ اس کی بجائے پائی نے تجویز دی کہ وید خطوں کو رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے اس کے گھر کے پتے پر بھیج دے۔ نہرو کی ساکھ کو نقصان پہنچنے کے حوالے سے وید کی فکرمندی کو بھی پائی نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ پائی نے لکھا تھا: ''تم دیکھ چکے ہو گے کہ چند ایک پرچیوں سے گمراہ کن مفہوم نکالا جاسکتا ہے' تاہم وزیراعظم خود ان کے غلط استعمال کے حوالے سے فکرمند نہیں ہیں۔ بہرحال تم ان خطوں کو بھیج دو' میں انہیں دیکھ لوں گا۔''

وید نے پائی کو دوبارہ خط لکھا۔ اس خط میں اس نے نہرو کے ایک خط کی عبارت نقل کی تھی۔ نہرو اس خط میں لکھتا ہے کہ وہ رات دس بجے کے بعد شردھا ماتا سے مل سکتا ہے۔ پائی پر اس خط کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے جواباً لکھا: ''کسی

شخص کو کیا پڑی ہے کہ اس خط کا غلط مفہوم نکالے۔ ہم آپ کے خط کو اس لیے اہمیت نہیں دے رہے کہ آپ کے نقل کردہ پیغام کا غلط مفہوم نکالا جا سکتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے اس عورت کا تاثر اچھا نہیں پڑتا۔"

تاہم وید نے دہلی جا کر خط ذاتی طور پر نہرو کو سونپنے کا فیصلہ کیا۔ نہرو نے اس کو ملاقات کا شرف بخشا اور نشانی کے طور پر اسے ایک زیادہ بے ضرر خط دیا۔ وید اس خط کو دکھا کر جب ضرورت پڑے اس سے ملاقات کر سکتا تھا۔ نہرو نے اسے ایک خاص فون نمبر بھی دیا' جس پر وہ اس سے کسی بھی وقت بات کر سکتا تھا۔ نہرو نے اسے کچھ کاموں کی بھی پیشکش کی۔ تاہم وید نے اس کی پیشکش یہ کہتے ہوئے رد کر دی کہ وہ تو جذبۂ حب الوطنی کے تحت اور نہرو کی ساکھ کے تحفظ کی خاطر خطوط دینے آیا تھا۔

شردھا ماتا 1948ء میں ہندو مہاسبھا میں نہرو سے متعارف ہوئی تھی۔ ہندو مہاسبھا کا سربراہ شیام پرساد مکرجی تھا۔ وہ شردھا ماتا سے کلکتہ میں ملا تھا۔ اس نے شردھا ماتا کو ویدوں پر لیکچر دیتے اور ہزاروں افراد کے مجمعوں کو سحر زدہ کرتے دیکھا۔ اس نے اسے دہلی آنے کی دعوت دی۔ اس نے "ہندو بھارت" کے موضوع پر کئی جلسوں سے خطاب کر کے دہلی میں بھی متاثر کن آغاز کیا۔ مکرجی کو علم تھا کہ نہرو نوجوان خوبرو حسیناؤں کا دلدادہ ہے۔ اسی لیے اس نے شردھا ماتا کو نہرو سے ملانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

پہلے پہل تو نہرو نے سادھوؤں اور سادھویوں سے اپنی پیدائشی نفرت کی وجہ سے ملنے سے انکار کر دیا لیکن مکرجی نے اپنے ایک دوست جگت نارائن لال کو تیار کیا کہ وہ شردھا ماتا کو نہرو کی رہائش گاہ پر لے جائے۔ خوش بدن عورت کی ایک ہی جھلک نے نہرو کو دیوانہ بنا دیا۔ نہرو نے شردھا ماتا کو ملاقات کے لیے پندرہ منٹ

دیئے تھے لیکن وہ ملاقات ڈیڑھ گھنٹے پر محیط ہوگئی' اور اس کے بعد متعدد ملاقاتیں ہوئیں ــــ اکثر رات کو دیر گئے۔

مارچ 1949ء تک ہندو مہاسبھا کے لیڈر اپنے منصوبے کی کامیابی کی خوشیاں منانے لگے۔ راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق انٹیلی جنس بیورو (آئی بی) نے ہندو مہاسبھا کے اشوتوش لہری کا وی۔ڈی۔ساورکر کو لکھا ہوا خط پکڑا اور ہوم منسٹر دلبھ بھائی پٹیل کو دیا۔ لہری نے نہرو کے ساتھ شردھا کے ''فعال رابطے'' پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا: ''مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ قوتیں ہندوستان کی قسمت سنوار رہی ہیں۔ کون جانے کہ یہ رابطہ بالکل نئی پیشرفتوں کا باعث بن جائے۔''

4 مارچ 1949ء کو پٹیل نے وہ خط نہرو کو پیش کیا اور اس سے اس کی وضاحت چاہی۔ نہرو نے سارے معاملے کو سرسری سے انداز میں لیتے ہوئے اسی روز جواب دیا:

''......یہ بات بالکل سچ ہے کہ یہ عورت مجھے دہلی اور لکھنؤ میں کئی بار مل چکی ہے...... (ہم) نے عمومی طور پر دو موضوعات پر گفتگو کی تھی ــــ ''ہندو کوڈ بل'' (The Hindu Code Bill) اور ہندوستانی زبان یعنی ہندی کا مسئلہ۔ اس نے ان دو معاملات پر مجھے قائل کرنے کی کوشش کی جبکہ میں نے اس سے اپنا موقف منوانے کی کوشش کی۔ مجھے تو کوئی کامیابی نہ ملی' تاہم جہاں تک میرا تعلق ہے تو اسے بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔''

شردھا نہرو سے زیادہ صاف گو نکلی۔ اس نے نہرو کی وفات کے 15 سال بعد خوش ونت سنگھ کو دیئے گئے انٹرویو میں کہا:

''اورنگ زیب روڈ والے مکان میں ہونے والی پہلی ہی

ملاقات میں ہمارے درمیان ایسی بے تکلفی پیدا ہوگئی جیسے ہم ایک دوسرے کو پچھلے جنموں سے جانتے ہوں۔ وہ میری باتوں سے متاثر ہوا تھا۔ (پھر اس نے اپنے چہرے اور سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) میں اس بات کو رد نہیں کروں گی کہ وہ اس طرف مائل ہوگیا تھا۔ میں اس سے کئی مرتبہ ملی اور ہماری ایک ایک ملاقات کئی کئی گھنٹوں پر محیط ہوتی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو بھانپ لیا۔ اس نے مجھ سے کئی مرتبہ میری شادی اور میرے خاوند کے بارے میں پوچھا۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ اگر میں آزاد ہوتی اور اگر میں نے سنیاسن کا عہد نہ کیا ہوا ہوتا تو کوئی اور عورت (لیڈی ماؤنٹ بیٹن، پدمجا نائیڈو، میریدلنی سربھئی) نہیں بلکہ میرا نام لیا جاتا' کہ جس سے وہ شادی کرنے کا خواہاں ہوتا۔ تاہم ایسا کبھی نہیں ہوا۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ میں ایک سنیاسن ہوں اور اسے برہمن ہونے کے ناطے ہندو روایات کا پاس کرنا چاہیے۔"

شردھا نے اس امر سے انکار کردیا کہ ان کے تعلقات صرف افلاطونی (Platonic) ہی رہے' اس سے آگے نہیں بڑھے۔ تاہم خوش ونت سنگھ اس کی بات سے قائل نہیں ہوا۔ اس نے راقم الحروف کو بتایا: "اس کی باتوں سے واضح تھا کہ ان میں افیئر تھا۔"

1996ء میں جسٹس دیبی سنگھ تیواتیہ کو ڈاکٹر وید کا خط موصول ہوا' جس میں اس نے اس سے ملاقات کا وقت مانگا تھا۔ دونوں میں ملاقات ہوئی تو وید نے' جو کہ

اس وقت 80 کے پیٹے میں تھا' نہرو کا دیا ہوا خط اسے دیا۔ خط بے ضرر سی صرف دو سطروں پر مشتمل تھا۔ تاہم وید نے تیواتیہ کو مبینہ طور پر نہرو کے ناجائز بچے کی جو کہانی سنائی' وہ حیران کن تھی۔

تیواتیہ شردھاماتا کو 1952ء سے جانتا تھا۔ اس زمانے میں وہ اور سنیاسن لندن میں 48۔ پارلیمینٹ سٹریٹ پر واقع ایک بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے' اور وہ نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات کے بارے میں جانتا تھا۔ تیواتیہ کہتا ہے: ''وہ ایک کٹڑ ہندو اور بہت اچھی مقرر تھی۔'' تیواتیہ نے بتایا کہ اس کا چہرہ تو سادہ سا تھا لیکن اس کی آواز مسحور کن تھی' خصوصاً جب وہ میرابائی کے بھجن گاتی۔ تیواتیہ' جو اس وقت قانون کا نوجوان طالب علم تھا' سنیاسن سے اکثر ملتا اور الٰہیاتی معاملات پر اس سے گفتگو کرتا۔ شردھا ان معاملات پر بہت معلومات رکھتی تھی۔ وہ ان موضوعات پر ہندی اور انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھتی رہتی تھی' جو اس کے کمرے میں ہر طرف ڈھیروں کی صورت میں پڑی رہتی تھیں۔

تیواتیہ کو معلوم ہوا کہ شردھا سلطان پور میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کی پرورش اس کی پھوپھی نے کی تھی' جو کہ ایودھیا کے نزدیک ایک چھوٹے سے راجواڑے کی حکمران تھی۔ 14 سال کی عمر میں اس کی شادی آگرہ میں وکالت کرنے والے اپنے ایک دور کے کزن سے ہوگئی۔ شادی کے دو ہفتے بعد اس نے گاندھی کے آشرم میں پناہ لے لی۔ بعدازاں وہ ہمالیہ چلی گئی۔ وہ 26 سال کی عمر میں ایک مکمل سنیاسن بن کر ہمالیہ سے اتری۔ اب وہ ایک زبردست مقرر اور ایک زندہ دیوی بن چکی تھی۔ شردھا نے اپنے سیاسی روابط کو چھپایا نہیں' بالخصوص نہرو کے ساتھ روابط کو۔ تیواتیہ بھی نہرو کا مداح تھا۔ شردھا نے نہرو کے ساتھ اپنے قریبی تعلقات کے حوالے سے اسے جو کچھ بتایا' وہ اسے نہرو کی توہین محسوس ہوا۔ تیواتیہ کہتا ہے:

''میں اس کے ساتھ دست شناسی کے غیر منطقی پن کے حوالے سے بحث کر رہا تھا کہ اچانک وہ بولی: ''کیا تم پنڈت جی کو عقلیت پسند سمجھتے ہو؟ وہ کسی بچے کی طرح میرے سامنے ہتھیلی پھیلا کر قسمت کا حال پوچھا کرتا تھا۔''

ایسا لگتا ہے کہ شردھا اس وقت کے نائب صدر سروپلی رادھا کرشنن کی بھی شناسا تھی۔ جب وہ دو سال بعد ہندوستان واپس جانے لگی تو اس نے تیواتیہ سے کہا کہ وہ رادھا کرشنن کو فون کرے۔ اس نے تیواتیہ کو جو فون نمبر دیا وہ لندن کے ایک ہوٹل کا تھا۔ جب رادھا کرشنن کو بتایا گیا کہ فون شردھا کا ہے تو وہ فوراً لائن پر آ گیا۔ تیواتیہ کہتا ہے کہ شردھا کے فون کے دو ہفتے بعد رادھا کرشنن نے اس کی ہوائی جہاز کے ذریعے ہندوستان واپسی کا بندوبست کر دیا تھا۔

تیواتیہ تقریباً ایک سال بعد اگست 1955ء میں فرید آباد ہریانہ میں شردھا سے دوبارہ ملا۔ اس کے کاٹیج کے اردگرد خاردار باڑ لگی ہوئی تھی اور کئی خونخوار کتے پہرا دے رہے تھے۔ اس کا ایک چیلا اسے اندر لے کر گیا۔ وہ دونوں اسی سہ پہر دہلی جانے والے تھے۔ شردھا نے اسے اپنی نئی پیکارڈ کار میں لفٹ کی پیشکش کی۔ تیواتیہ کہتا ہے کہ اس کا ڈرائیور ایک خوبصورت فرانسیسی تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس زمانے تک غیر ملکیوں سے اس کی نفرت ختم ہو چکی تھی۔

''حد تو یہ ہے کہ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے کسی غیر ملکی عورت کو شادی کے لیے ڈھونڈ لیا ہے؟ جب میں نے کہا کہ وہ تو ہندوستانیوں کے غیر ملکیوں کے ساتھ شادی کرنے کے خلاف تھی تو وہ بولی: ''ہندوستانی بہت برے ہوتے ہیں۔ غیر ملکی بہت اچھے ہوتے ہیں۔''

سنیاسن شردھاماتا سے تیواتیہ کی اگلی ملاقات 1966ء میں ہوئی۔

"وہ راجستھان ہاؤس کے ایک کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ میں اس سے ملنے گیا۔ وہ بالکل بدل چکی تھی۔ اس کا وزن بہت کم ہوگیا تھا اور اس کے خیالات زیادہ ترقی پسندانہ ہوچکے تھے۔ وہ لیفٹننٹ بن چکی تھی۔ اس نے اندرا گاندھی کے حوالے سے کچھ کہا، جسے میں اس وقت سمجھ نہیں پایا۔ اس نے مجھے کہا: "وہ چڑیل میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔" تیواتیہ نے اس کی وجہ نہیں پوچھی۔ جب وہ دس سال بعد وید سے ملا تو اسے وجہ سمجھ آ گئی۔"

تیواتیہ شردھا سے 1985ء میں دوبارہ ملا۔ یہ ملاقات ایک شادی کے موقع پر ہوئی تھی۔ دہلی روانگی سے ایک رات پہلے اس نے سنا کہ شردھا اس کے ہوٹل کے ساتھ واقع ایک متروک قلعے میں ٹھہری ہوئی ہے، جو اسے اس کے ایک عقیدتمند نے دیا تھا۔ وہ اتنی بدل گئی تھی کہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ وہ شوگر کی مریضہ ہوچکی تھی۔ تاہم وہ لندن میں ہونے والی پہلی ملاقات ہی کی طرح دوستانہ انداز میں ملی۔ یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔

شردھا ماتا، جو کہ شاید ہندوستان کے پہلے وزیراعظم کے مردہ پیدا ہونے والے بچے کی ماں تھی، 1987ء میں فوت ہوئی۔

❀❀❀

ناول کے کردار

جے بھگوان

یہ ناول کا ہیرو ہے' اسے وہ خود اور سب لوگ وکٹر کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ ہر پہلو سے کسی انگریز جنٹلمین کا بیٹا لگتا ہے۔ اس کے اور عوام میں طبقے اور مزاج کا فرق بہت زیادہ ہے۔ وہ ایک خاص انسان ہے اور اسے اس امر کا پتا تب سے تھا جب اس کی عمر پانچ سال تھی اور باپو گاندھی نے اسے اپنی گود میں بٹھا کر پیشگوئی کی تھی کہ وہ ایک عظیم آدمی بنے گا۔ وہ گاندھی کی ہر بات سے اختلاف رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہندوستان میں جدید ٹیکسٹائل ملیں' لوہے کے کارخانے' کاریں بنانے کے کارخانے' بڑے بڑے ڈیم اور ہزاروں میل لمبی نہریں ہوں۔ تمام بستیاں سڑکوں کے ذریعے باہم مربوط ہوں۔ ملک میں زیادہ سکول' کالج اور ہسپتال ہوں۔

کرشن لال مٹّو

یہ جے بھگوان کا باپ ہے۔ وہ ایک نہایت کامیاب وکیل ہے اور لوگوں کی میزبانی فیاضی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ گاندھی کا مداح ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مہنگے شوق اور انگریزوں جیسے اطوار ترک نہیں کرتا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی پرورش طبقۂ اشرافیہ کے کسی انگریز کی طرح کرنا چاہتا ہے۔

ویلیری بوٹوملی

یہ مٹّو کے بچوں کی انگریز گورنیس ہے۔ وہ اس کے گھرانے کی ایک رکن بن جاتی ہے اور اس کی خواہش کے مطابق اس کے بچوں کو مکمل طور پر انگریز بنا دیتی

ہے۔ مٹو کے دوست ویلیری کو اس کی میم کہتے ہیں۔ مٹو کے دشمن ویلیری کو اس کی ''رکھیل'' کہتے ہیں۔

بھارتی

یہ جے بھگوان کی بیٹی ہے۔ وہ اس کے حسن اور دولت کی وارث ہے۔ اس کو گھر پر تعلیم و تربیت دی جاتی ہے لیکن وہ امتحان دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ ماں باپ کی لاڈلی اور غصہ ور ہے۔ وہ عموماً لوگوں کو تحقیر سے دیکھتی ہے۔ وہ سرد مزاج اور کینہ پرور ہے۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح خلوت پسند ہے۔ اسی لیے لوگ اس کی جنسی زندگی کے بارے میں اشاروں کنایوں میں باتیں کرتے ہیں۔ وہ دہلی کی سب سے زیادہ تیز زبان والی لڑکی ہے۔

مدھون نائر

کمزور اور فاقہ زدہ دکھائی دینے والا یہ شخص کیرالہ سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ جے بھگوان کی زندگی میں بہت زیادہ اثر رکھنے والا انسان بن جاتا ہے۔ وہ نرگسیت پسند ہے۔ اسے اس کی اوقات یاد دلانے والی بھارتی کی نخوت اور تیز زبان سے اسے دھچکا لگتا ہے۔ جے بھگوان اس کے مداح شاگرد سے اس کا سرپرست بن جاتا ہے تو وہ اس تبدیلی کو کبھی معاف نہیں کرتا۔

ماں درگیشوری

یہ دلکش بدن والی ایک نوجوان سنیاسن ہے۔ وہ جے بھگوان کے اختیار اور اثر ورسوخ سے متاثر نہیں ہوتی۔ وہ بوڑھے ہوتے ہوئے جے بھگوان کو مادہ پرست

مغرب کے ''مایا جال'' سے نجات دلاتی ہے اور دوسری چیزوں کے علاوہ اسے یوگا بھی سکھاتی ہے۔

سوامی دھنن جے مہاراج برہمچاری

وہ چھ فٹ لمبا شخص ہے۔ اس کے بدن پر ایک اونس گوشت بھی اضافی نہیں ہے۔ وہ ململ کے صرف ایک باریک ٹکڑے سے ستر پوشی کرتا ہے لیکن یہ کپڑا ڈھانپتا کم اور عیاں زیادہ کرتا ہے۔ وہ ابتدا میں جے بھگوان کو یوگا سکھاتا ہے لیکن انجام کار اس کی بیٹی کا بستر گرم کرتا ہے۔

سمندر میں تدفین

(ناول)

پہلا باب

اس کی لاش دو دن تک گورنر کی محل نما رہائش گاہ کے دربار ہال میں رکھی رہی۔ راج بھون کو شہریوں کے لیے کھول دیا گیا تھا' تاکہ وہ اس شخص کو خراجِ عقیدت ادا کر سکیں' جس نے ان کے ملک کے لیے ہر شخص سے زیادہ کام کیا تھا۔ اگرچہ اسے صرف چند لوگ ہی ذاتی طور پر جانتے تھے تاہم وہ ایک لیجنڈ بن گیا تھا۔ راج بھون کے داخلی دروازے کے باہر پھولوں کی چادریں لیے عقیدت مندوں کی ایک میل لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ پروٹوکول ختم کر دیا گیا تھا۔ پولیس صرف اس امر کو یقینی بنا رہی تھی کہ ماتم گسار اس چارپائی کے قریب سے گزر کر آگے بڑھتے رہیں' جس پر وہ پڑا تھا' اور اس کے چہرے سے فتح مندی جھلک رہی تھی۔ رک کر اس کی بیٹی کی ایک جھلک دیکھنے کے خواہش مندوں کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ ہال میں صرف اس کی دو ادھیڑ عمر بہنوں کو دیکھا جا سکتا تھا' جو کہ اہم افراد کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔

اس کی وصیت اس کی وفات کے اگلے روز اخباروں میں شائع ہوئی۔ اس نے اپنی ساری جائیداد اپنی اکلوتی بیٹی بھارتی کو دے دی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو ہدایت کی تھی کہ اسے سمندر میں اس جگہ دفنایا جائے جہاں اس کی کشتی ''جل بھارتی'' عموماً لنگرانداز رہتی تھی۔ یہ جگہ گیٹ وے آف انڈیا اور ایلیفینٹ آئی لینڈ کے

درمیان تھی۔ اس نے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی اپنی کشتی میں گزاری تھی۔ وہ وہاں سے بمبئی کی سکائی لائن کا شاندار منظر دیکھا کرتا تھا۔ کشتی میں وہ بمبئی کے شور اور تعفن سے محفوظ رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی زندگی کا سفر اسی جگہ ختم ہو۔ اس نے خاص طور پر ہدایت دی تھی کہ اس کی تدفین کے موقع پر کوئی مذہبی رسم ادا نہیں کی جائے۔

جنازے اور تدفین کا انتظام بھارتی کر رہی تھی۔ اس نے گورنر سے کہا کہ اس کے باپ کی لاش کو ٹھیک دس بجے راج بھون سے لے جانے کے لیے توپ گاڑی کا بندوبست کیا جائے۔ جنازے کے جلوس کو اس تیس منزلہ عمارت کے سامنے دس منٹ کے لیے رکنا تھا' جس کا نام اس کے باپ کے نام پر جے بھگوان ٹاورز رکھا گیا تھا۔ یہ عمارت اس کی بہت سے انٹرپرائزز کا عمومی دفتر تھی۔ جنازہ یہاں ٹھہرانے کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ملازمین اسے آخری مرتبہ الوداع کہہ سکیں۔ اس کے بعد جنازے کو گیٹ وے آف انڈیا جانا تھا' جہاں جل بھارتی لنگرانداز تھی۔ توپ گاڑی کے پیچھے صرف پانچ کاریں ہونا تھیں۔ پہلی کار میں بھارتی اکیلی بیٹھتی' اس کے بعد دو کاروں میں اس کی پھوپھیاں' ان کے شوہر اور بچے ہوتے' چوتھی کار میں اس کا گرو اور یوگا ٹیچر سوامی دھنن جے مہاراج ہوتا اور آخر میں ایک کھلی وین میں اس کے مرحوم باپ کی بااعتماد رفیقہ' ماں درگیشوری اپنے پالتو شیر ''شیرو'' کے ساتھ موجود ہوتی۔ ماں درگیشوری ایک تانتری پجارن تھی۔ کشتی پر صرف بھارتی' اس کا یوگا ٹیچر' ماں درگیشوری اور شیرو کو جانے کی اجازت تھی۔

ٹھیک 10 بجے راج بھون میں ایک توپ داغی گئی۔ اس کی گرج سارے شہر میں سنائی دی۔ کبوتروں کے غول اڑنے لگے اور عمارتوں پر چکر لگانے کے بعد اپنے ٹھکانوں پر واپس آ گئے۔ ہزاروں کوے غصے سے کائیں کائیں کرتے اڑنے لگے۔ پھر خاموشی دوبارہ چھا گئی۔ فوجی بینڈ ماتمی دھن بجاتا ہوا جنازے کے آگے

آ گے چل رہا تھا۔ بے شمار لوگ میرین ڈرائیو کے دونوں جانب کھڑے تھے۔ بالکونیوں میں کھڑے لوگ جنازے پر گلابوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ عورتیں اس مرد کے لیے سسکیاں لیتے ہوئے رو رہی تھیں' جسے ان میں سے بیشتر نے کبھی نہیں دیکھا تھا' لیکن جسے وہ ساری زندگی اپنے آس پاس محسوس کرتی رہی تھیں۔

جے بھگوان ٹاورز کے سامنے ٹھہرنے کے بعد توپ گاڑی گیٹ وے آف انڈیا کی طرف بڑھ گئی۔ سڑکوں اور کھلی جگہ میں لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ بھارتی کار سے باہر نکلی۔ اس نے سفید ساڑھی پہنی ہوئی تھی اور سیاہ عینک لگا رکھی تھی تاکہ اس کی سوجی ہوئی آنکھیں چھپ جائیں۔ کھلے تابوت کو توپ گاڑی سے اتارا گیا۔ چھ فوجیوں نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھایا اور بہت بڑے گیٹ سے گزر کر آہستہ آہستہ کشتی کی طرف بڑھنے لگے۔ جے بھگوان کی بہنوں ان کے شوہروں اور بچوں نے جھک کر تابوت کو تعظیم دی اور فرماں بردار اردلیوں کی طرف آ گئے۔ سفید ململ کی لنگی باندھے اور اسی رنگ کا لمبا سا کپڑا اوپری دھڑ پر لپیٹے لمبا تڑنگا اور جسیم سوامی دھنن جے مہاراج بھارتی کے پیچھے چل رہا تھا۔ شیر کی رنگت کے سکرٹ اور زعفرانی رنگ کے ریشمی کرتے میں ملبوس ماں درگیشوری بھی شیرو کی چاندی کی زنجیر تھامے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے' ہجوم فلک شگاف نعرے لگانے لگا: جے بھگوان زندہ باد! جے بھگوان امر رہیں!

وہ کشتی پر چلے گئے۔ کشتی کو آہستہ آہستہ وسیع آسمان تلے پھیلے خاکستری سبز سمندر میں لے جایا جانے لگا۔

☆☆☆

سمندر میں جس جگہ جے بھگوان کی لاش کو ڈبویا گیا' وہاں کیا کچھ بیتی' اس کا علم صرف بھارتی' سوامی جی' ماں درگیشوری اور شاید شیرو کو تھا۔ لوگوں نے ضرور یہ

سوچا تھا کہ اگر جے بھگوان اپنے جنازے میں کسی مذہبی رسم کو ادا کروانا نہیں چاہتا تھا تو سوامی جی اور تانتری عورت وہاں کیا کر رہے تھے؟ وہ اپنے ریڈیوسیٹوں پر سوامی جی کو یوگا کے آسن بیان کرتے اور قدیم سنسکرت کتابوں سے اشلوک پڑھتے ہوئے سن چکے تھے۔ وہ اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ جے بھگوان اور بھارتی کے کتنا قریب تھا؟ زندہ شیر کے ساتھ ماں درگیشوری کی موجودگی کہیں زیادہ پریشان کن تھی۔ افواہیں پھیلی ہوئی تھیں کہ جے بھگوان دہریہ ہونے کے باوجود تانتری عورت کے کالے جادو کا شکار ہو چکا تھا۔ تاہم سوال یہ تھا کہ ایک گنوار سی پجارن اور ایک تہذیب یافتہ ارب پتی کاروباری شخص میں کون سی شے مشترک تھی؟ سوال ہر گزرتے ہفتے اور پھر ہر گزرتے برس کے ساتھ زیادہ ہوتے گئے لیکن کسی سوال کا کوئی واضح جواب سامنے نہیں آیا۔

صرف دو عورتوں، شیر اور سوامی کو علم تھا کہ جے بھگوان کی خواہش کے برعکس اس کی روح کو سکون دینے کے لیے پرارتھنا کی گئی تھی اور اس کی لاش کو بحیرۂ عرب کے سپرد کرنے سے پہلے اس پر پوتر گنگا جل چھڑکا گیا تھا۔ صرف وہ جانتے تھے کہ اس کے بعد ان میں سے ایک فرد نے ''بمبئی نگری'' میں واپس نہ آنے کا عہد کیا۔ اس کے الفاظ تھے: ''سکھی رہو۔ سب تمہارا ہے، اپنی بس گنگا مائی اور اس کی یاد۔''

تاہم جے بھگوان کی لاش کو سمندر میں ڈالے جانے سے چند منٹ پہلے کشتی کے پرائیویٹ کیبن میں کیا ہوا تھا اس کا علم بھارتی اور سوامی جی تک کو نہیں تھا۔ بھارتی نے ماں درگیشوری کو جے بھگوان کے قریب تنہائی میں کچھ لمحے گزارنے کا موقع دیا تھا۔ ماں درگیشوری نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ وہ کھلے تابوت کے قریب پہنچی اور ایک منٹ تک خاموش کھڑی رہی۔ پھر اس نے جھک کر مردہ آدمی

کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنے کرتے میں سے ایک چھوٹی سی قینچی نکالی اور جے بھگوان کے نیلگوں سیاہ بالوں کی تین لٹیں کاٹ لیں۔ وہ اس کی کوئی نشانی اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

جے بھگوان کی یادداشتیں تیس سال پہلے شائع ہو چکی تھیں۔ اس کتاب میں اس نے اپنے سیاسی اور سماجی نظریات بیان کیے تھے اور ہندوستان کو ایک عظیم ملک بنانے کے اپنے منصوبوں کا ذکر کیا تھا۔ اس نے اپنے خاندان، اپنے دوستوں اور اپنی جذباتی زندگی کے بارے میں بہت کم باتیں لکھی تھیں۔ اس نے اپنی زندگی کے ان پہلوؤں کے حوالے سے جو کچھ لکھا تھا، اس کی بنیاد ان دنوں ہونے والی گپ شپ ہی تھی: وہ اتنا تنہائی پسند کیوں ہے؟ اس نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟ ورگیشوری اس پر کس قسم کی گرفت رکھتی ہے؟

بھارتی کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس کی دو سوانح عمریاں شائع ہو چکی تھیں، جو اس سے لیے گئے انٹرویو کی بنیاد پر لکھی گئی تھیں۔ اس نے کسی انٹرویو میں بھی اپنے خاندان کے افراد اور اپنے جذباتی رشتوں کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا کسی سیاسی، سماجی یا معاشی مکتبۂ فکر سے تعلق نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے ہندوستان اور سوئٹزرلینڈ کے سکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی۔ اس سے جب بھی مستقبل کے منصوبوں کے بارے میں پوچھا گیا، اس نے سادہ سا جواب دیا: ''میں اپنے باپ کے ورثے کو آگے لے جانا چاہتی ہوں۔'' وہ بھی اپنے باپ کی طرح انتہائی تنہائی پسند تھی۔ اسے اپنے دلکش باپ اور حسین ماں کی طرف سے ورثے میں خوبصورتی ملی تھی۔ فطری سی بات تھی لوگ اس کی عشقیہ زندگی کے حوالے سے قیاس آرائیاں کرتے رہتے تھے۔ کچھ لوگ کہتے کہ

اس نے اپنے باپ کو اپنا آئیڈیل بنا لیا تھا اور اسے کوئی اتنا اچھا شخص نہیں ملا جسے وہ اپنا شوہر بنا لے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ جنسی اعتبار سے سرد ہے اور اس میں جنس کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ کسی کو اس کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ علم نہیں تھا کہ وہ ایک مغرور عورت ہے اور اپنی راہ میں رکاوٹ بننے والے کسی شخص کو معاف نہیں کرتی۔

ان باتوں کے باوجود ہم باپ اور بیٹی کے نزدیک ترین آ جانے والے لوگوں کے ان کے بارے میں دیئے گئے بیانات کی مدد سے خالی جگہیں پر کر سکتے ہیں نیز اپنی عقل سے کچھ اندازے لگا سکتے ہیں۔ ہم مصدقہ ہونے کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے تاہم ان کی شخصیت کا مطالعہ دلچسپ ضرور ہے۔

دوسرا باب

جے بھگوان کا باپ کرشن لال مٹو اپنے اکلوتے بیٹے کی پرورش کسی انگریز ارسٹوکریٹ کی طرح کرنا چاہتا تھا۔ وہ اکثر اپنے بچوں اور بیوی سے کہتا تھا (وہ ہندی لکھ اور پڑھ سکتی تھی، اس لیے وہ اسے نیم تعلیم یافتہ کہا کرتا تھا) کہ انگریزوں سے معاملہ کرنے کے لیے انسان کو انہی کی طرح انگریزی بولنی پڑے گی، ان کے ساتھ مساوی انداز میں سماجی میل جول رکھنا پڑے گا، انہیں کی طرح چاندی کے قیمتی چھری کانٹوں کے ساتھ مہنگے چینی کھانے کھانا سیکھنا پڑے گا اور انہیں ان کی استطاعت سے زیادہ مہنگی پریمیئم سکاچ اور فرانسیسی شرابیں پلانا پڑیں گی۔ تبھی انسان کو ان کے منہ پر یہ کہنا ہو گا کہ اب وقت آ گیا ہے وہ ہندوستان سے چلے جائیں اور ہندوستانیوں کو اپنے معاملات خود نمٹانے دیں۔

مٹو ایسے خیالات کا حامل ہونے کی استطاعت رکھتا تھا۔ اس نے ایک وکیل کی حیثیت سے دہلی اور ہندوستان کی دوسری ہائی کورٹوں میں کام کر کے بہت پیسہ کمایا تھا۔ اکثر اوقات اس کا سامنا انگریز بیرسٹروں سے ہوتا اور وہ قانون پر ان سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتا۔ ہندوستانی نواب، زمیندار اور صنعت کار اس کی خدمات حاصل کرتے اور اسے منہ مانگی فیس ادا کرتے۔ اس کی ساکھ اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اگر تم مٹو کو اپنا وکیل بنا لیتے تو تم اس کے منہ کھولنے سے پہلے ہی آدھی

جنگ جیت جاتے۔ مٹو نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی ابتدا ہی میں دہلی کی سول لائنز میں ایک دو منزلہ مینشن تعمیر کروا لیا تھا۔ اس مینشن کی انیکسی میں اس کا دفتر تھا۔ مہمانوں کے لیے دو خواب گاہوں والا وِلا تھا اور دلکش پھولوں والا وسیع وعریض باغ تھا۔ اس باغ میں گلاب کی ایسی اقسام اگائی گئی تھیں جو ہندوستانیوں نے پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ اس نے اس مینشن کا نام شانتی بھون رکھا تھا۔ اسے اپنی اس عظیم ترین جائیداد پر بہت فخر تھا اور وہ ہندوستانی اور انگریز دولت مند اور مقتدر لوگوں کو اس مینشن میں مدعو کر کے خوش ہوتا تھا۔ وہ اکثر ایسے لوگوں کے اعزاز میں ضیافتیں کیا کرتا تھا۔ وہ ایک فیاض میزبان تھا۔ شہزادے اور صوبوں کے انگریز گورنر اس امر کے مشتاق رہتے تھے کہ وہ انہیں مدعو کرے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان کی خدمت میں اعلیٰ ترین کھانے اور شرابیں پیش کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات وہ ان کے لیے شہر کے پرانے علاقے سے انتہائی تہذیب یافتہ طوائفوں کو بلا لیتا تھا' جو ان کے لے مجرا اور گانا پیش کرتی تھیں۔

مہاتما گاندھی جب بھی دلی آتا' مٹو کے ہاں قیام کرتا تھا۔ اسی کی طرح دوسرے بہت سے اعلیٰ رتبے والے افراد مٹو کے گھر میں قیام کیا کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی اور مٹو میں ایک خصوصی تعلق تھا۔ ابتدا میں تو مٹو کو جنوبی افریقہ سے آنے والے اس نیم عریاں قوم پرست لیڈر پر غصہ آیا تھا' وہ اس پر ہنسا بھی تھا۔ یہ نیم عریاں لیڈر عدم تشدد' تجرد اور تمام غیر ملکی اشیا کے بائیکاٹ کا پرچار کرتا تھا۔ اس نے تو یہاں تک سنا تھا کہ وہ فاقہ کشی اور اینیما کا شوقین ہے اور لیٹرینیں خود صاف کرتا ہے! جب وہ دلی میں انڈین نیشنل کانگرس کے ایک لیڈر کے گھر اس سے پہلی بار ملا' تو اسے ایک برخود غلط قسم کا لیکچر دینے پر تیار ہو گیا' تاہم اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ گاندھی نے اس کی تعریف کی کہ انگریزوں کو ان کے اپنے قانون میں بری

طرح پچھاڑ کر اس نے ہندوستان کو بہت عزت دلائی ہے۔ اس نے کہا تھا ''مٹو صاحب! یہ بھی آزادی کی جنگ ہی ہے۔'' مٹو برسوں سے احساس جرم کا شکار تھا' کیونکہ اس کی کامیابی سے جلنے والے لوگ اسے ہندوستان دشمن اور انگریز روایات کا غلام قرار دیتے تھے۔ گاندھی کے الفاظ نے اکسیر کا سا کام کیا۔ وہ ہر جگہ گاندھی کا ذکر اور تعریفیں کرنے لگا حالانکہ اس نے اپنے مہنگے ذوق اور انگریز طور اطوار ترک نہیں کیے تھے۔

ایک مرتبہ گاندھی دلی آیا تو مٹو نے بچوں کو انگریزیانے کے حوالے سے اپنے تصورات اس کے سامنے بیان کیے۔ اس کو توقع تھی کہ گاندھی اس کے تصورات کی زبردست مخالفت کرے گا۔ تاہم گاندھی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے کہا ''میں تم سے متفق ہوں۔ ہمارے پاس ایسے کچھ ہندوستانی ہونے چاہئیں جو انگریزوں کو اس زبان میں دھتکار سکیں' جسے وہ سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم انہیں اتنی زیادہ انگریزیت نہ سکھاؤ کہ وہ ہندوستانی ہونے پر شرم محسوس کرنے لگیں۔ ان کی جڑیں ہندوستان کی دھرتی میں مضبوطی سے رہنی چاہئیں۔'' مٹو اس کی بات سن کر بے حد خوش ہوا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو بلا کر انہیں گاندھی سے آشیرباد دلائی۔ مہاتما نے پانچ سالہ جے بھگوان کو گود میں اٹھایا اور کہا: ''بیٹا تم بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہو؟'' لڑکے نے بغیر ہچکچاہٹ کے جواب دیا: ''باپو میں آپ کی طرح مہاتما بننا چاہتا ہوں۔''

مہاتما نے لڑکے کو زور سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔ ''تم اپنے باپو سے بھی بڑے آدمی بنو گے۔ ایشور تمہاری عمر دارز کرے!''

اس کے تھوڑے عرصے بعد مٹو نے دی ٹائمز آف لندن میں ایک اشتہار دیا: ''چار بچوں پر مشتمل ایک ہندوستانی گھرانے کو ایک آیا کی ضرورت ہے۔ چار

بچوں میں تین لڑکیاں ہیں اور ایک لڑکا۔ 450 پونڈ سالانہ کے ساتھ رہائش اور کھانا فراہم کیا جائے گا۔ کم از کم قیام تین سال ہو گا۔ انگلینڈ سے ہندوستان اور ہندوستان سے انگلینڈ کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔ اپنی دستاویزات' حوالوں اور ممکن ہو تو فوٹو گراف کے ساتھ درخواست دیں۔''

ایک ماہ کے اندر اندر تیس سے زیادہ درخواستیں موصول ہوئیں۔ مٹو نے ہر درخواست کا بغور جائزہ لیا اور تصویریں اپنی بیوی اور بچوں کو دکھائیں۔ انہوں نے ایک عورت ویلیری بوٹو ملی کو منتخب کیا۔ اس کی عمر 35 سال تھی۔ اس نے کالج کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ وہ اورلینز کے نزدیک واقع ایک فرانسیسی ارسٹوکریٹ گھرانے کے شاتو میں گورنیس کی حیثیت سے کام کر چکی تھی۔ اب وہ اپنے والدین کے ساتھ لندن میں رہتی تھی۔ لندن میں اس کا باپ' جو افریقہ میں مشنری کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکا تھا پادری تھا۔

ویلیری بوٹو ملی دلی پہنچ گئی۔ مٹو نے ریلوے سٹیشن پر اس کا خیر مقدم کیا اور اپنی کار میں بٹھا کر اپنے مینشن میں لے آیا۔ اس کی بیوی اور بچے اس کے استقبال کے لیے صف باندھے کھڑے تھے۔ وہ ہو بہو اپنی تصویر کے مطابق تھی۔ فرق بس اتنا تھا کہ وہ زیادہ جیتی جاگتی تھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ خاکستری اور بالوں کا رنگ سنہرا تھا۔ اس کی جلد کی رنگت سرخ تھی اور چہرا دھبوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ہڈ پیر چوڑے تھے اور صحت بہت اچھی تھی۔ مٹو توجہ دیئے بغیر نہیں رہ سکا کہ اس کی چھاتیاں بڑی بڑی اور کولہے موٹے موٹے تھے۔ کسی وجہ سے اسے ایک پادری کی بیٹی کا ایسا سراپا موزوں دکھائی دیا۔ وہ ان کے سلام کے جواب میں بولی: ''مجھے یہاں آ کر خوشی ہوئی ہے۔ میں جانتی ہوں' مجھے ہندوستان سے محبت ہو جائے گی اور میں آپ سب سے محبت کروں گی۔''

ویلیری بوٹو ملی مٹو کے گھرانے میں شامل ہوئی تو ان کی زندگی گزارنے کے انداز میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ شانتی بھون میں گھریلو رشتوں میں بھی ایک تبدیلی آ گئی۔ اس نے پہلے پندرہ روز تو صورتحال کو سمجھنے میں گزارے۔ وہ ملازموں سمیت ہر ایک سے نہایت تہذیب کے ساتھ پیش آئی تھی۔ وہ مٹو کو ''سر'' اور اس کی بیوی کو ''میڈم'' کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ اس نے ان کی رضامندی سے بچوں کے انگریزی نام رکھ دیئے' جیسا کہ ہندوستانی اشرافیہ میں عام تھا۔ اس نے لڑکیوں کے نام نینسی' روبی اور فائیونا رکھے۔ لڑکے کا نام اس نے وکٹر رکھا اور بولی: ''ینگ سر آپ کے نام کا مطلب ہے فاتح۔'' بچوں نے نئے نام خوشی سے قبول کیے اور ایک دوسرے کو ان ناموں سے پکارنے لگے۔ اس نے ہر ایک کو سکھایا کہ کوئی شے مانگنے سے پہلے ''پلیز'' کہیں اور جب وہ چیز مہیا کر دی جائے تو ''تھینک یو'' کہیں۔ اس تصویر سے باہر رہنے والی واحد ہستی میڈم مٹو تھی۔ اس نے چھری کانٹے سے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور ہاتھوں ہی سے کھانا جاری رکھا۔ اس نے فنگر باؤل میں ہاتھ دھونے سے بھی انکار کر دیا اور ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن پر جاتی تھی۔ وہ واش بیسن میں کلی بھی کرتی تھی۔ اس کے خاوند نے اسے کہا کہ وہ ان کے لیے شرمندگی کا باعث بن رہی ہے۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد اس نے اکیلے کھانا کھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ چپاتیوں کی جگہ سلائس نے لے لی تھی جبکہ اس کا کھانا تو گھی میں تر تراتی ہوئی دو گرم گرم چپاتیوں کے بغیر نامکمل تھا۔

ویلیری بوٹو ملی نے اپنے فرائض کو سنجیدگی سے نبھایا۔ جب لڑکیاں کانونٹ گئی ہوتیں' وہ وکٹر کو انگریزی' ریاضی' جغرافیہ اور ہندوستان کی تاریخ پڑھایا کرتی تھی۔ وکٹر کو اردو اور ہندی پڑھانے کے لیے ایک مولوی اور ایک پنڈت آیا کرتے تھے۔ تاہم اسے ان دونوں سے پڑھنے میں لطف نہیں آتا تھا اور وہ ویلیری سے پڑھنے

کا منتظر رہتا تھا' جو اسے افلاطون' گیلی لیو (Galileo) ' کنگ آرتھر کے بارے میں بتاتی اور بائبل پڑھ کر سناتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے اسے کاروں اور اس زمانے کے ہوائی جہازوں کی تصویریں بھی دکھائیں۔ وہ اس کے ختم نہ ہونے والے سوالات کے جتنے بہتر ممکن تھے جواب دیتی۔ جب لڑکیاں سکول سے واپس آتیں تو وہ انہیں ہوم ورک کرنے میں مدد دیتی اور دیسی لہجے میں بولی جانے والی انگریزی کی اصلاح کرتی۔ وہ انہیں نئے نئے کھیل سکھاتی۔ اس نے انہیں بیڈمنٹن اور ٹینس کھیلنا سکھایا۔ اتوار کے دنوں میں وہ انہیں دلی کی یادگاروں کی سیر پر لے جاتی۔ اس نے انہیں لال قلعے' پرانا قلعے' قطب مینار' ہمایوں کے مقبرے' صفدرِ جنگ کے مقبرے' لودھی بادشاہوں کے مقبروں اور لودھی گارڈن کی سیر کرائی۔ رفتہ رفتہ دلی میں اس کا دل لگ گیا۔ مٹو کے گھر میں اس کا دل اس دوسرے گھر سے زیادہ لگ گیا' جہاں وہ کام کر چکی تھی۔ اسے تین سال بعد اپنے گھر واپس جانے کی سہولت حاصل تھی لیکن تین سال بعد وہ اپنے گھر واپس نہیں گئی۔ مٹو ویلیری بوٹوملی کا بہت ممنون تھا۔ وہ اس کے خاندان کی رکن بن چکی تھی۔ اس نے اس کے بچوں کو اسی طرح مکمل طور پر انگریز بنا دیا جس طرح کہ وہ چاہتا تھا۔

مٹو شام کے وقت اپنے مؤکلوں کو رخصت کرنے کے بعد ویلیری کے کمرے میں جا کر اس کے ساتھ دو ایک جام پیا کرتا تھا۔ ابتدا میں اس کا خبط اسے اپنی خوبصورت لیکن روایتی بیوی سے دور لے گیا تھا اور اب انگریز افسروں کے درمیان اور مغرب زدہ امراء کے درمیان بے مثال کامیابی کے کئی سال بعد علیحدگی کا عمل مکمل ہو چکا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے قربت کا دکھاوا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ویلیری سمجھتی تھی کہ اسے ایک دشوار دن گزارنے کے بعد سکون اور اچھی صحبت کی طلب ہوتی ہے۔ تاہم ابتدا میں اس کا رویہ محتاط رہا۔ وہ اس سے اچھی گفتگو کرتی' کچھ

نسوانی ادائیں دکھاتی اور اس کی آمد سے پہلے بھیجی ہوئی عمدہ سکاچ پلاتی۔ اس نے اپنے اور ''سر'' کے لیے رات کے کھانے کی میز پر کچھ نئی قسم کی فرانسیسی شرابیں رکھنا شروع کیں۔ بچوں کو کانچ کے گلاسوں میں سنسناتے ہوئے مشروبات پیش کیے جاتے۔ وہ انہیں اٹھا کر ''چیئرز'' اور ''آپ کی اچھی صحت کے لیے'' کہہ کر نوش کرتے۔ وکٹر خوش تھا کہ اس کے ساتھ بالغوں جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ وہ ویلیری کو بہت پسند کرنے لگا تھا۔ اس کی بہنیں، جو عمر میں اس سے بڑی اور زیادہ حساس تھیں، اپنی ماں کی دوری کی وجہ سے اپنی گورنیس اور اپنے باپ کی بڑھتی ہوئی قربت کے بارے میں مشکوک ہونے لگیں۔ اس دوران انہوں نے اس کا نام ایف بی بی یعنی موٹے کولہوں والی بوٹوملی رکھ دیا۔

درحقیقت لڑکیوں کے مشکوک ہونے سے کافی پہلے ہی ویلیری اور مٹو ایک دوسرے کے قریب ہو چکے تھے۔ ایک شام سخت مصروف دن گزارنے کے بعد مٹو نے ویلیری سے فرمائش کی کہ وہ اسے معمول سے بڑا جام بنا کر دے۔ تین جام پینے کے بعد اس پر نشہ طاری ہو گیا اور وہ اسے بتانے لگا کہ ایک غلط عورت کے ساتھ شادی کرنے کی وجہ سے کس قدر تنہا ہے۔ ویلیری نے کہا کہ وہ میڈم سے انصاف نہیں کر رہا۔ اس نے یہ بھی اصرار کیا کہ وہ اپنی آواز دھیمی رکھے تاکہ اس کا خاندان اور نوکر اسے ایسی باتیں کرتے ہوئے نہ سنیں۔ مٹو اٹھا اور دروازہ بند کر کے اسے اندر سے کنڈی لگا دی۔ دروازہ بند کر کے وہ پلٹا اور اس کے صوفے کے پاس آ کر اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ''میں ایک تنہا انسان ہوں'' وہ روتے ہوئے بولا ''میری مدد کرو۔'' چونکہ ویلیری کا دل بھی اس پر آ گیا تھا' اس لیے اس نے اپنے بلاؤز کے بٹن کھول دیے۔ اس کی چھاتیاں باہر ابھر آئیں اور ممنون مٹو نے ایک آہ کے ساتھ اپنا چہرا ان میں چھپا لیا۔ ''گھر والوں کو شک ہو جائے گا۔ ہمارے پاس

زیادہ وقت نہیں ہے۔" ویلیری نے سرگوشی کی۔ مٹو اس کے اشتیاق سے خوش ہو کر پیچھے ہٹا اور اسے حکم دیا کہ وہ اپنی پینٹ اتار کر اس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک جائے۔ وہ اپنے بڑے بڑے کولہے اس کے سامنے کرتے ہوئے گھٹنوں کے بل جھک گئی۔ مٹو اپنی خوشی کا اظہار کرنے کے لیے ناک سے ہلکی ہلکی خرخراہٹ کی آواز نکالنے لگا۔ وہ دوبارہ گھٹنوں کے بل کھڑا ہوا اور پیچھے سے دخول کیا۔ "یوں زیادہ دیر نہیں لگتی۔" اس نے کہا۔ مشنری کی بیٹی کھلکھلاتی ہوئی بولی "آپ ایک وحشی ہیں' سر!" مٹو سکول کے لڑکوں جیسی بے تابی کے ساتھ اس پر حاوی ہو گیا۔ چالیس سال کی عمر میں اس کو بچپن کے خواب کی تعبیر مل گئی تھی — ایک گوری میم کے ساتھ زنا کرنے کا خواب۔

☆☆☆

پانچ مزید برس گزر گئے۔ جے بھگوان' جو ہر کسی کے علاوہ اپنے لیے بھی وکٹر تھا' ہر اعتبار سے کسی انگریز جنٹل مین کا بیٹا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے گلوبند' ویسٹ کوٹ اور دھاری دار ٹراؤزر پہنا ہوتا تھا۔ اس کے اطوار مہذبانہ تھے۔ ایک شام مٹو نے ویلیری سے کہا "میں اسے انگلینڈ کے کسی بہترین پبلک سکول میں اور پھر آکسفورڈ یا کیمبرج اور انزآف کورٹ میں تعلیم دلانا چاہتا ہوں۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟"

ویلیری نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: "انگلینڈ میں بہت سے اعلیٰ درجے کے پبلک سکول ہیں۔ وہاں ایٹن اور ہیرو ہے۔ انہیں کے معیار کے رگبی' ونچسٹر' سینٹ پالز' ہیلبری اور کچھ دوسرے پبلک سکول ہیں۔ میں آپ کی طرف سے انہیں لکھ کر داخلہ فارم منگوا لوں گی۔ کسی اچھی پوزیشن پر فائز پبلک سکول کے کسی سابق طالب علم کا حوالہ مل جائے تو داخلے میں آسانی ہو گی۔ مجھے یقین ہے

وائسرائے اور کچھ صوبوں کے گورنر ان میں سے کسی نہ کسی پبلک سکول میں پڑھ چکے ہوں گے۔ تم ان میں سے کچھ کو ضرور جانتے ہو گے۔"

"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" مٹو نے جواب دیا۔ "تم داخلہ فارم منگواؤ باقی کام میں کر لوں گا۔"

یہ کام مٹو کی سوچ سے بھی زیادہ آسان نکلا۔ وہ کسی عدالتی کام سے الٰہ آباد گیا تو گورنر سے ملا اور اسے اپنے بیٹے کے حوالے سے اپنے منصوبوں سے آگاہ کیا۔ "یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔" گورنر نے کہا۔ وہ ایٹن کا سابق طالب علم نکلا تھا۔ "وہ کسی لڑکے میں سے پست تصورات کو نکالنے اور اسے ایک قابل قدر جنٹل مین میں ڈھالنے کی دنیا کی سب سے اچھی جگہ ہے۔ میں تمہارے بیٹے کے لیے ہیڈ ماسٹر کو لکھ دوں گا۔ تم نے اس کا نام کیا بتایا تھا؟"

"جے بھگوان مٹو۔ اسے مس ویلیری بوٹوملی نامی ایک انگریز گورنیس گھر پر ہی تعلیم دے رہی ہے۔ میں اسے ایک انتہائی قابل قدر خاتون تصور کرتا ہوں۔ انگلش پبلک سکول میں بچے کو تعلیم دلوانے کا آئیڈیا اسی نے دیا تھا۔ اس نے میرے بیٹے کو جے بھگوان کی جگہ ایک انگلش نام دیا ہے — وکٹر۔"

گورنر نے کاغذ کے ایک پرزے پر ایک نوٹ لکھا "میں تمہیں ایک خط بھیجوں گا۔ تم اس خط کو لڑکے کے داخلہ فارم کے ساتھ منسلک کر دینا۔" پھر اس نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو انگلینڈ میں اس کے نام سے مٹو کا لفظ نکال دیتا۔ اس کے لیے وکٹر جے بی بہت اچھا نام رہے گا۔ تم اگلی مرتبہ الٰہ آباد آؤ تو لڑکے کو اپنے ساتھ لے آنا۔ میں اسے دیکھنا پسند کروں گا۔"

مٹو ایک ہفتے بعد الٰہ آباد دوبارہ گیا۔ وہ اپنے بیٹے اور ویلیری بوٹوملی کو ساتھ لے گیا تھا۔ گورنر کی بیوی نے ان تینوں کو چائے پر مدعو کیا۔ وکٹر کو سکھایا جا چکا

تھا کہ اسے اپنے میزبان اور اس کی بیوی سے کس طرح مخاطب ہونا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح اچھے طور اطوار کا مظاہرہ کر رہا تھا ''یور ایکسی لینسی! آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے مجھے مدعو کیا۔'' اس نے مصافحے کے لیے گورنر کی بیوی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ویلیری نے سرخم کر کے دونوں کو تعظیم دی اور جب تک اس سے سوال نہیں کیا گیا کوئی بات نہیں کی۔ گورنر نے وکٹر سے دو ایک سوال کیے۔ ''ینگ مین! تمہاری عمر کیا ہے؟''

''یور ایکسی لینسی اگلی سالگرہ پر میں تیرہ برس کا ہو جاؤں گا۔''

''گڈ' گڈ اور تم کیا بننا چاہتے ہو؟ ہندوستان کا ممتاز وکیل یا کسی ہائیکورٹ کا جج؟''

''یور ایکسی لینسی ابھی تک میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ میرے باپ کی خواہش ہے کہ میں وکیل بنوں لیکن میں ریلوے انجنوں' کاروں اور ٹرکوں جیسی چیزیں بنانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے ہندوستان کو وکیلوں سے زیادہ ان چیزوں کی ضرورت ہے۔''

سب ہنسنے لگے۔ ''تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔'' گورنر بولا۔ ''محسوس نہ کرنا کہ میں تمہارے باپ کے سامنے ایسا کہہ رہا ہوں تاہم وکیل بڑی خطرناک شے ہوتے ہیں۔'' سب دوبارہ ہنسنے لگے۔ گورنر ویلیری بوٹوملی سے مخاطب ہوا۔ ''میرا خیال ہے اسے پریپ (Prep) سکول جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے مس بوٹولومی؟''

''نہیں' یور ایکسی لیسی۔ میں نے اسے وہ سب مضمون پڑھا دیئے ہیں' جو وہ پریپ سکول میں پڑھاتے ہیں۔ اس کی عمر اتنی ہے کہ یہ کسی پبلک سکول میں داخلہ لے سکتا ہے۔ یہ ذہین بھی ہے۔''

''میں نے جو تھوڑا بہت دیکھا ہے' اس سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ آپ نے اپنا کام بہت عمدگی سے ادا کیا ہے۔''

''تھینک یو' یور ایکسی لینسی۔''

ایٹن کے ہیڈ ماسٹر کے نام خط میں گورنر نے لکھا کہ اس نے لڑکے کا انٹرویو خود لیا ہے اور اس کی ذہانت سے مطمئن ہے۔ اس خط سے معاملہ طے ہوگیا۔ ماسٹر وکٹر جے۔ بی کو مائی کلمس ٹرم کے شروع میں سکول میں داخلہ مل سکتا تھا۔

مٹو نے گاندھی کو خط لکھ کر بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کو ایٹن میں داخلہ دلوا رہا ہے۔ اس نے گاندھی سے اپنے بیٹے کے لیے آشیرواد مانگی۔ گاندھی نے پوسٹ کارڈ کے ذریعے اس کے خط کا جواب دیا اور اس کے فیصلے کو درست قرار دیا۔ اس نے لکھا تھا: ''ہمیں انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ان سے ان کی بہترین چیزیں ضرور حاصل کرنی چاہئیں۔ تاہم جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ہماری جڑیں ہماری دھرتی میں ہی رہنی چاہئیں' اگر میں بمبئ آیا تو جے سے کہنا کہ مجھ سے ضرور ملے اور میری آشیرواد لے۔ میں دوسروں کی نگاہوں میں مہاتما ہوں گا' اس کے لیے تو میں باپو گاندھی ہوں۔''

مٹو نے گاندھی کا خط اپنی بیٹیوں کو دکھایا اور اپنی بیوی کو پڑھ کر سنایا۔ ان سب کو وکٹر پر بہت فخر محسوس ہوا۔ آخر وہ باپو گاندھی کا پسندیدہ بچہ تھا! وہ سب مہاتما سے مرعوب تھے: مسز مٹو اس کی پیروی میں ہر سہ پہر ایک گھنٹہ چرخہ کاتتی تھی جبکہ لڑکیاں کھڈی کا بنا ہوا کپڑا پہنتی تھیں۔ مٹو نے اپنے سٹائل اور سہولتوں کے حوالے سے ایسا کوئی سمجھوتہ تو نہیں کیا تاہم وہ گاندھی کا زبردست مداح تھا۔ ویلیری بوٹولی کو بھی ایک ایسے لڑکے کی استانی ہونے پر فخر تھا' جو مساوی طور پر اعلیٰ درجے کا انگریز اور ہندوستانی تھا۔ وکٹر کی روانگی سے چند ہفتے پہلے اس نے اسے ''میرے خوابوں کا

ہندوستان'' کے موضوع پر مضمون لکھنے کا کہا۔ وہ اس مضمون کو گاندھی سے بمبئی میں بچے کی ملاقات سے پہلے اسے بھیجنا چاہتی تھی۔

وکٹر ایک سنجیدہ ذہن والا لڑکا تھا تاہم اس نے ابھی تک ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ اس کا ذہن تو سکندر اور نپولین کے کارنامے اور کاروں اور ایسی مشینوں کی تصویروں سے بھرا ہوا تھا' جو اس نے اپنے ملک میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اسے یونہی سا اندازہ تھا کہ گاندھی کے ذہن میں کیا ہے۔ اس نے اپنے باپ سے کہا کہ وہ اس کی وضاحت کرے۔ اس کے باپ نے اسے حوالے کی کچھ کتابیں مطالعے کے لیے دے دیں۔ ''گاندھی یا کسی دوسرے شخص کی باتوں سے اثر مت لو۔ کوشش کر کے اپنا ذہن خود بناؤ'' مٹو نے اسے نصیحت کی۔

وکٹر نے یہ کام اتنے جوش وخروش کے ساتھ کیا' کہ تیرہ سالہ لڑکے سے اتنے جوش وخروش کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ اس نے نوٹس بنائے' خاکے تیار کیے' انہیں پھاڑ دیا اور پھر سے سارا کام کیا۔ اس نے اپنے باپ' بہنوں' ماں اور اپنی گورنیس سے سوالات پوچھے۔ ''اس کا خیال ہے کہ وہ جدید ہندوستان کا آئین تیار کر رہا ہے۔'' ایک صبح اس کی بڑی بہن نے تبصرہ کیا تھا۔ وکٹر نے اس کے طنز کو نظرانداز کر دیا۔

پندرہ دن بعد وکٹر نے اپنا حتمی خاکہ تیار کر لیا۔ اس کا مضمون اس اقتباس سے شروع ہوا تھا:

''میں ایک عظیم قوم کو خوابیدہ دیکھ رہا ہوں — وہ صرف ایک لفظ کی منتظر ہے' جس سے وہ دوبارہ جی اٹھے گی۔''

''تم نے یہ اقتباس کہاں سے لیا ہے؟'' ویلیری بوٹو ملی نے اس سے

پوچھا۔

''ایڈورڈ کار پینٹر نامی کسی مصنف کی تحریر سے۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔''

''تب تمھیں ضرور لکھنا چاہیے کہ یہ بات کس نے کہی تھی۔ تمھیں کسی دوسرے شخص کی بات کا اعزاز بالکل نہیں لینا چاہیے۔''

وکٹر شرمندہ ہوگیا۔ اس نے کہا: ''ٹھیک ہے' میں اس کا نام بھی درج کردوں گا۔''

ویلیری نے اس کا لکھا ہوا مضمون پڑھا۔ اس نے گاندھی کے ہر موٗقف سے اختلاف کیا تھا۔ ان میں شامل تھے: کھڈی کا بنا ہوا کپڑا' خودانحصار بستیاں' بنیادی تعلیم۔ وکٹر ایک ایسا ہندوستان دیکھنا چاہتا تھا جس میں جدید ٹیکسٹائل ملیں' سٹیل پلانٹس' آٹوموبائل فیکٹریاں' بڑے بڑے ڈیم اور ہزاروں میل لمبی نہریں' سڑکوں کے ذریعے آپس میں ملی ہوئیں بستیاں' زیادہ سکول' کالج اور ہسپتال ہوں' مختصر یہ کہ دنیا کا سب سے زیادہ خوش حال' مذہبی اور ذات پات کے تعصبات سے آزاد ملک۔ اس نے اپنے مضمون کے آخر میں لاطینی جملہ درج کیا تھا۔ **Novus Ordo Seclorum** ...... ''زمانوں کے لیے نیا نظام۔''

ویلیئر مسکرانے لگی۔ اس نے لڑکے کو تھوڑی بہت لاطینی پڑھائی تھی لیکن وہ اس ماٹو سے واقف نہیں تھا۔ ''تم نے یہ کہاں سے لیا؟''

''امریکی آئین سے۔'' اس نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

''میرا خیال ہے بوڑھا تمہارے خیالات کو پسند نہیں کرے گا'' ویلیئر نے کہا۔ ''بہتر یہ ہے کہ تم یہ مضمون اپنے والد کو ایک نظر دکھا دو۔''

متو نے اپنے بیٹے کے مضمون کو کئی مرتبہ پڑھا۔ اس نے مضمون کی بہت

سی نقول بنالیں۔ ایک نقل اس نے گاندھی کو بھیجی' ایک نقل صوبہ جاتِ متحدہ کے گورنر کو بھیجی اور دوسری نقول اس نے اپنے دوستوں کو دیں۔ سب نے مضمون پڑھ کر تعریفی خط لکھے۔ گورنر نے لکھا: ''اگر وہ تیرہ برس کی عمر میں ایسا مضمون لکھ سکتا ہے تو وہ مستقبل میں بہت آگے تک جائے گا۔'' مٹو کو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بہت آگے تک جائے گا تاہم اسے گاندھی کے ردعمل کے حوالے سے قدرے فکر تھی کہ جانے وہ کیا کہے۔

چند ہفتوں بعد وکٹر اور ویلیری بوٹوملی فرنٹیئر میل کے ذریعے بمبئی چلے گئے۔ انہیں شاندار طریقے سے دہلی سٹیشن سے الوداع کیا گیا۔ مٹو کے سارے رشتہ دار اور دوست پھولوں کے ہار لیے اس موقع پر موجود تھے۔ حد تو یہ ہے کہ خاندانی پنڈت نے بھی' جو کہ برہمن ہونے کے ناطے سمندر پار جانے کے حوالے سے کچھ تحفظات رکھتا تھا' لڑکے کو کالے پانی پار کرنے کے گناہ سے معافی دلوانے کے لیے پرارتھنا کی۔ وکٹر کی ماں اور بہنیں اپنے آنسوؤں کو ضبط نہ کرسکیں۔ اس کا باپ بالکل جذباتی نہیں ہوا۔ اس نے کہا: ''انگلستان پہنچتے ہی مجھے تار بھیجنا اور ہاں ہمیں ہر اتوار فون کر کے اپنی خیریت سے آگاہ کرنا مت بھولنا۔''

ویلیری بوٹوملی چھٹی منانے اور ایٹن میں وکٹر کو داخلے میں مدد دینے کے لیے انگلستان جا رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے مٹو کے اہلِ خانہ کو الوداع کہا اور اپنے اور وکٹر کے لیے ریزروڈ فرسٹ کلاس کے کوپے میں چلی گئی۔ جب ٹرین سٹیشن سے نکلی تو اس نے دیکھا کہ وکٹر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ جذباتی لڑکا نہیں تھا تاہم اپنے گھر والوں سے چند سال کے لیے دور ہو جانا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس نے اپنے گلے سے ہار اتار کر میز پر رکھ دیئے اور کھڑکی کے قریب بیٹھ کر دیہات کے مناظر دیکھنے لگا۔

وہ ایکسپریس ٹرین تھی۔ وہ متھرا نہیں رکی' آگرہ میں پانچ منٹ کے مختصر وقت کے لیے رکی اور بمبئی کی طرف تیزی سے سفر کرتی رہی۔ ویلیری نے وکٹر کو مخاطب نہیں کیا۔ وہ دوپہر کے کھانے کے وقت تک خاموش بیٹھے رہے۔ اس نے مسز متھو کا دیا ہوا پیکٹ کھولا اور چھوٹی چھوٹی پلیٹیں' چمچ اور چھری کانٹے نکالے۔

اس نے خوشگوار لہجے میں کہا: ''لڑکے! چلو اٹھو! تم انگلینڈ میں بہت عمدہ وقت گزارنے جا رہے ہو۔ تم سکول میں انگریز معاشرے کے بہترین فرزندوں کے ساتھ کھیلو گے۔ چھٹیوں کے دوران لندن میں خوبصورت انگریز لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ کرو گے۔ میں تمہیں ہائیڈ پارک کے نزدیک فلیٹ دلوا دوں گی' جہاں تم اپنے دوستوں کے ساتھ خوشیاں منا سکو گے۔ خوب مزے کرنا۔ انگلینڈ اور یورپ کی سیر کرنا۔ مجھے یقین ہے تمہیں یہ ملک بہت پسند آئے گا۔''

وکٹر کو علم تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ وہ تو کئی مہینوں سے ایسے ہی خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایٹن ونڈسر کیسل' لندن' آکسفورڈ' کیمبرج' نیو فاریسٹ' کیٹس وڈ' مڈلینڈ وغیرہ کی نہایت عمدہ تصویریں اکٹھی کی تھیں۔ ان کے علاوہ اس نے بیلے ڈانسرز اور گھوڑوں اور سائیکلوں پر سوار خوبصورت انگریز لڑکیوں کی تصویریں بھی اکٹھی کی تھیں۔ ان تصویروں نے اس میں انہیں جاننے کی خواہش پیدا کر دی تھی۔ تاہم اس کا دل اب بھی اداس تھا اور اس نے کھانا خاموشی سے کھایا۔ اداسی اس پر حاوی تھی۔ وہ اس طرح کی کیفیت سے ناآشنا تھا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ ایسی کیفیت سے کس طرح چھٹکارا پایا جاتا ہے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ نیم غنودگی کے عالم میں دیہاتی مناظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔ سہ پہر تک وکٹر بہتر محسوس کرنے لگا۔ رات کے کھانے پر انہوں نے خوشگوار انداز میں باتیں کیں اور کھانے کے بعد سکون سے سو گئے۔ اگلی

صبح ٹرین بمبئی کے وکٹوریا ٹرمینس پہنچ گئی۔ مٹو کے ایک صنعت کار دوست نے ان کے خیر مقدم کے لیے اپنا سیکرٹری بھیجا تھا۔ وہ انہیں مالا بار ہل میں اس کے گھر لے گیا۔ دو دن بعد انہیں پی او سٹیمر سٹر یتھ کلائیڈ پر سوار ہو کر ساؤتھیمپٹن روانہ ہونا تھا۔

وکٹر نے اس سے پہلے سمندر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرین ڈرائیور سے گزرتے ہوئے اس نے پانی کے عظیم پھیلاؤ کو حیرت کے ساتھ دیکھا۔ مالا بار والے مینشن سے بحر ہند کا شاندار منظر دکھائی دیتا تھا۔ اس آگہی نے کہ پانی کا یہ عظیم پھیلاؤ ہندوستان کا حصہ ہے' اسے اپنے وطن کے حوالے سے بے پناہ فخر و انبساط عطا کیا۔ یہاں سب کچھ ممکن دکھائی دیتا تھا۔ اس صبح سمندر کے ساتھ اس کا ایک گہرا تعلق استوار ہوا' جسے آئندہ برسوں میں مزید مضبوط ہونا تھا۔

دوپہر کے کھانے پر ویلیری اور اس کی ملاقات اپنے میزبان' اس کی بیوی اور ان کے بہت سے بیٹوں اور بیٹیوں سے ہوئی۔ دوپہر کا کھانا سبزی خوروں والا (Vegetarian) تھا۔ کھانا چاندی کی تھالیوں اور کٹوریوں میں پیش کیا گیا تھا۔ انہیں کھانا چھری کانٹے کے بغیر ہاتھوں سے کھانا پڑا' جو کہ ان کے لیے کوفت کا باعث تھا۔ تاہم ان کے میزبانوں نے ان کی کیفیات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میزبان گھرانہ کشمیری لڑکے کی شخصیت اور انگلستان کے بہترین پبلک سکول میں اس کا داخلہ ہو جانے کی حقیقت سے بے حد مرعوب تھا۔ جب میزبان نے بتایا کہ گاندھی گجرات میں واقع اپنے آشرم سے اسے ملنے کے لیے بمبئی آیا ہے تو اس کی بیوی اور بچے مزید مرعوب ہو گئے۔ اسے اگلی صبح ٹھیک گیارہ بجے مہاتما سے ملنا تھا۔ (وہ سب جانتے تھے گاندھی پابندیٔ وقت کا بہت خیال رکھتا ہے)۔ ان کی ملاقات ایک اور صنعت کار کے گھر ہونا تھی' جہاں گاندھی قیام پذیر تھا۔ اگرچہ وہ گھر کار پر چند منٹ کے فاصلے پر تھا' تاہم وہ وہاں بروقت پہنچنا یقینی بنانا چاہتا تھا۔

وکٹر گاندھی سے ملنے اکیلا گیا۔ اسے اس وسیع وعریض کمرے تک لے جایا گیا، جہاں وہ عظیم انسان قیام پذیر تھا۔ وہ فرش پر بیٹھا اپنے نام آنے والے خطوں کے جواب لکھ رہا تھا۔ ڈھیر سارے پوسٹ کارڈ اس کے پہلو میں فرش پر دھرے تھے۔ جونہی وکٹر کمرے میں داخل ہوا، اس نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ انہیں اگلے آدھے گھنٹے تک ڈسٹرب نہیں کیا جائے۔ ''آؤ بیٹا! میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔ زمین پر بیٹھنا آرام دہ تو نہیں ہوتا، تاہم ہمارے ملک کے بیشتر مردوزن زمین پر ہی بیٹھتے اور سوتے ہیں۔'' وکٹر کو گاندھی کے سامنے پہنچتے ہی سکون کا احساس ہونے لگا تھا، وہ اس کی ماں کی سی گرم، نرم خوشبو کا حامل تھا۔ وکٹر کا مضمون پہلے ہی سے گاندھی کے پہلو میں فرش پر دھرا ہوا تھا۔ ''میں نے تمہارا مضمون پوری توجہ سے پڑھا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تم ہندوستان کے مستقبل کے حوالے سے میرے نظریے کو نہیں مانتے۔ تم ہندوستان کو مغرب کے رنگ میں رنگا اور مادی اشیاء سے بھرا ہوا دیکھنا چاہتے ہو۔ ہو سکتا ہے تم نے درست لکھا ہو، کیونکہ بیشتر ہندوستانی امیر بننا چاہتے ہیں، وہ بڑے بڑے گھروں میں رہنا، موٹر کاروں میں پھرنا اور فینسی ملبوسات پہننے کے خواہاں ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ اپنی ان مادی خواہشات کو پورا کرلیں گے، لیکن اس عمل کے دوران وہ اپنی روحیں اور اپنا ہندوستانی پن کھو بیٹھیں گے۔''

وکٹر نے اس کی باتوں میں دخل دیتے ہوئے کہا: ''باپو! مجھے تو ان روحوں وغیرہ کی سمجھ نہیں آتی۔''

گاندھی مسکرایا۔ اس نے کہا: ''کیا تم بھگوان کو مانتے ہو؟''

''میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وکٹر نے جواب دیا۔

''میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں ہے۔''

''کیا تم سچائی کو مانتے ہو؟''

''بالکل۔ اسی لیے تو میں چاہتا تھا کہ آپ میرا مضمون پڑھیں۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ کو میری باتیں پسند نہیں آئیں گی' تاہم میں نے جو لکھا ہے' دل سے لکھا ہے۔ میں نے سچ کو جیسا دیکھا ویسا لکھ دیا ہے۔''

''اگر تم سچائی میں یقین رکھتے ہو تو تم بھگوان میں بھی یقین رکھتے ہو۔ اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

گاندھی نے اتنا کہہ کر اپنا ہاتھ وکٹر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''اچھا تو تم ایٹن اور پھر آکسفورڈ جا رہے ہو۔ اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے۔ تم بیرسٹر بننے کے لیے انز آف کورٹ میں بھی داخلہ لینا۔ میں انر ٹیمپل سے فارغ التحصیل ہوں۔ میں بیرسٹر بن گیا تھا لیکن میں نے چند سال بعد وکالت کا پیشہ ترک کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرے لوگوں کے جھگڑوں سے روزی کمانے کی بجائے دوسرے معاملات زیادہ اہم ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے' ایسا ہی نہیں ہے؟''

''بالکل' میں آپ سے متفق ہوں۔ لیکن میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔''

''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارا جب بھی دل چاہے مجھے خط لکھنا۔ ہوسکتا ہے میرے جواب مختصر ہوں لیکن میں تمہارے ہر خط کا جواب دوں گا۔ بھگوان تمہارا حامی و ناصر ہو۔''

یہ گفتگو دس منٹ ہی جاری رہی تھی۔ وکٹر نے گاندھی کے پیروں کو چھوا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔ وہ ایسی آسودگی محسوس کر رہا تھا' جیسی آسودگی کوئی کسی اوتار کی آشیرواد لے کر محسوس کرتا ہے۔

ویلیری اور وکٹر نے اگلا دن بمبئی کی سیر میں گزارا۔ وہ ایلیفینٹا غاریں دیکھنے گئے۔ انہوں نے دوپہر اور رات کا کھانا تاج میں کھایا' انہیں اپنے میزبانوں

کے سبزی خوروں والے کھانے بالکل پسند نہیں آئے تھے۔

''اس شہر میں کوئی شے ہندوستانی نہیں ہے' سوائے اس کے لوگوں کے۔''
وکٹر نے یہ بات اس وقت کہی تھی' جب وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد تاج سے باہر آ رہے تھے۔ تمام بڑی عمارتیں برطانوی انداز میں تعمیر کی گئی ہیں۔ واحد ہندوستانی عمارت ایلیفینٹا ہے اور وہ سمندر سے دو میل دور ہے۔''

ویلیری سمجھ نہیں سکی کہ وکٹر نے شکایت کی ہے یا محض تبصرہ کیا ہے' اس لیے وہ خاموش ہی رہی۔

اگلے روز ان کا میزبان انہیں سٹریتھ کلائیڈ پر سوار کرانے ان کے ساتھ بندرگاہ گیا۔ وہاں دو گینگ وے تھے۔ ایک فرسٹ کلاس کے مسافروں کے لیے اور دوسرا اکانومی کلاس کے مسافروں اور پورٹروں کے لیے۔ فرسٹ کلاس گینگ وے پر کوئی درجن بھر سفید فام تھے۔ وہاں وکٹر واحد ہندوستانی تھا۔ دوسرا گینگ وے ہندوستانیوں اور پورٹروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جنہوں نے اپنا اپنا سامان اٹھایا ہوا تھا۔ ویلیئیر اور وکٹر نے اپنے میزبان کو الوداع کہا اور عرشے پر چلے گئے۔ عرشے پر برسر نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے ساتھ ساتھ واقع کیبنوں تک چھوڑنے گیا۔ ایک گھنٹے بعد شہر کی فضاؤں میں سٹریتھ کلائیڈ کے سائرن کی آواز گونجنے لگی۔ جہاز کے لنگر اٹھا لیے گئے اور وہ دھیرے دھیرے کھلے سمندر کی طرف تیرنے لگا۔ وکٹر بمبئی کی سکائی لائن کو دور ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اب اسے چند سال بعد ہی ہندوستان کو دیکھنا تھا۔ نئی دنیا کی دریافت کا اس کا سفر شروع ہو چکا تھا۔
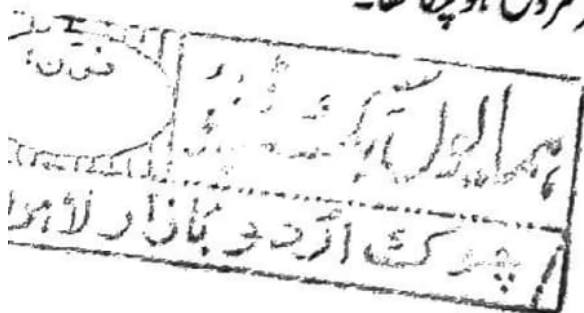
تیسرا باب

اگرچہ ستمبر کے مہینے کا درمیانی حصہ تھا لیکن مون سون گزرنے کے بعد بھی سمندر شورش برپا کر رہا تھا۔ ویلیری اور وکٹر کو دو افراد والی میز دی گئی تھی لیکن وکٹر نے دوپہر کے کھانے کا دوسرا کورس لینے سے پہلے ہی معذرت کی اور سونے کے لیے اپنے کیبن میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے بعد ویلیری اس کے لیے کچھ پھل اور ڈبل روٹی لے کر آئی۔

"وکٹر! تم ٹھیک تو ہونا؟ بہتر ہے تم کچھ کھا لو۔" اس نے پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

وکٹر بولا: "میں ٹھیک ہوں، بس پیٹ میں تھوڑی اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ میں اس کا عادی نہیں ہوں نا۔ فکر مت کرو میں جلد ہی سنبھل جاؤں گا۔"

وکٹر نے ویلیری کے ساتھ چائے بھی نہیں پی۔ وہ بس سیدھا پڑا رہا اور خود پر غصے ہوتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا "اگر ویلیری اور دوسرے سفید فام مسافر اس کیفیت پر قابو پا ہیں سکتے تو میں قابو کیوں نہیں پا سکتا؟"

برسوں ناز ونعم میں پلنے کی وجہ سے اس میں اک ذرا غرور اور نازک مزاجی پیدا ہو گئی تھی۔ اسے یوں بے بسی کے عالم میں پڑے رہنا بہت برا لگ رہا تھا۔ اگلے دن وہ اپنی قوتِ ارادی کے زور پر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے

ڈنر جیکٹ پہنی' جو اس کے باپ نے اس کے لیے سلوائی تھی اور چہل قدمی کرنے کے لیے عرشے پر چلا گیا۔ وہاں بہت کم لوگ موجود تھے۔ وہ عرشے پر ٹہلنے لگا اور سورج کو خاکستری پانیوں میں اترتے دیکھتا رہا۔ ڈنر گانگ بجا تو وہ ڈائننگ روم میں جا کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی بعد ویلیری بھی آ گئی۔ اس نے لمبا سا لباس پہنا ہوا تھا اور وکٹر کو ہمیشہ سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔

''میں تمہیں ڈھونڈتی رہی ہوں۔ تم نہ تو اپنے کیبن میں تھے اور نہ بار میں۔ کہاں تھے تم؟''

''میں ذرا ڈنر کے لیے بھوک بڑھا رہا تھا'' وکٹر نے گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ''میں عرشے پر ٹہلتے ہوئے جہاز کے ہچکولوں سے مانوس ہو رہا تھا۔ اب میں ڈنر سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں۔''

اور اس نے ایسا ہی کیا۔ بینڈ رقص کی موسیقی بجانے لگا: فاکس ٹراٹ' سمبا' والز۔ تین جوڑے فلور پر آئے۔ ویلیری نے وکٹر کو اس کی نشست سے اٹھایا اور بولی: ''آؤ لڑکے! تمہیں رقص ضرور سیکھنا ہو گا' ورنہ تم انگلستان کی سماجی زندگی سے باہر رہو گے۔''

وکٹر نے تعمیل کی۔ وہ پہلے اس کو رقص کرتے دیکھتا اور پھر اسی کی طرح رقص کرتا۔ اسے ابتدا میں تو دقت ہوئی لیکن پھر وہ رواں ہو گیا۔

''ہمارے ساؤتھمٹن پہنچنے تک تم رقص میں ماہر ہو چکے ہو گے۔'' ویلیری نے اسے یقین دلایا۔

اگلے چند روز سکون کے ساتھ گزر گئے۔ وہ عرشے پر ٹینس' بینگو اور دوسرے کھیل کھیلتا رہا۔ ایک شام وہ ڈنر پر ویلیری کی آمد کا منتظر تھا کہ اس نے سنا کہ اگلی میز پر بیٹھا آسٹریلوی جوڑا اسی کے بارے میں باتیں کر رہا ہے۔

ادھیڑ عمر عورت کہہ رہی تھی: ''یہ کالا خوبصورت ہے۔ ہے نا!''

''شش۔ تمہیں برے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔'' اس کا خاوند تیزی سے بولا۔

وکٹر کے چہرے پر غصے کی سرخی ابھری لیکن اس نے اپنے آپ کو ٹھنڈا ہی رکھا۔

عورت نے صفائی پیش کی: ''میں تو اسے خوبصورت کہہ رہی ہوں۔ یہ ضرور کوئی شہزادہ یا راجہ ہے۔ اس کے ساتھ موجود سفید فام عورت اس کی گورنیس ہے۔ میں پتا کر چکی ہوں۔''

اس کی یہ بات سن کر وکٹر کا غصہ اتر گیا۔ تاہم اسے ان سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ اس آسٹریلوی جوڑے نے اس کا اور ویلیری کا دوست بن جانا تھا۔

اسے ''کالا'' کہنے والی عورت نے پیش قدمی کی اور ان کی میز کے پاس آ کر بولی: ''معاف کیجئے گا' کیا آپ ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہونا پسند کریں گے؟ کیا آپ دونوں آپس میں باتیں کر کر کے تھکتے نہیں؟''

اس کی پیش قدمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی میزیں ساتھ ساتھ لگا دی گئیں اور آسٹریلوی جوڑے نے ان کے لیے فرانسیسی شیمپین کا آرڈر دیا۔

وکٹر آسٹریلوی عورت کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جب اس کے شوہر نے شیمپین گلاسوں میں انڈیلی تو اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ وکٹر نے پہلے کبھی کسی عورت کو سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑے تجسس کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔ اس کے سرخ ہونٹوں اور ناخنوں نے تو اس پر جادو سا کر دیا تھا۔ وہ وکٹر کی کیفیات سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جلد ہی اس نے اپنا ہاتھ میز کے نیچے وکٹر کی ران پر رکھ دیا اس

کے لمبے ناخن وکٹر کے خصیوں کو چھو رہے تھے۔ وکٹر کا سارا جسم تن گیا' تاہم وہ اپنے آپ کو نارمل ظاہر کرتا رہا۔

''اچھا تو تم اٹین جا رہے ہو'' وہ بولی۔ ''میں شرط لگا سکتی ہوں کہ تم انگریزوں سے زیادہ اچھی انگریزی بول سکتے ہو۔ مجھے تمہارا برطانوی لہجہ بہت پسند آیا ہے۔ تم انگریزوں کی طرح نک چڑھے مت بن جانا۔ کالے شہزادے ہی رہنا اور انہیں تھوڑی بہت تہذیب سکھانا۔''

تھوڑی ہی دیر بعد ڈنر آ گیا اور آسٹریلوی عورت نے وکٹر کی ران کو ہلکے سے دبانے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔

اس رات وکٹر آسٹریلوی عورت کے خواب دیکھتا رہا۔ اس نے خواب میں اسے عریاں دیکھا۔ اس کی چھاتیاں مہک رہی تھیں۔ وہ اس کے بستر پر بیٹھی ایک بہت لمبا سگریٹ پی رہی تھی اور اس کی رانوں کو سہلا رہی تھی۔ اسے پہلی بار خواب میں احتلام ہوا۔

اگلے دن وہ آسٹریلوی جوڑے سے دور دور رہا لیکن شام ہوئی تو وہ پھر اکٹھے بیٹھے تھے۔ عورت نے اپنے ہاتھ وکٹر کی ران سے دور ہی رکھے۔ اسے بڑا سکون محسوس ہوا۔ وہ انہیں آسٹریلیا سے جاپان تک کے اپنے بحری سفر کی روداد سناتی رہی۔ جہاز کے عدن پہنچنے تک ان میں بہت اچھے مراسم قائم ہو چکے تھے۔ ویلیری کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ان میں سے کوئی بھی عدن کی بندرگاہ پر نہیں اترا۔

اس نے کہا تھا: ''عدن میں دیکھنے کو کچھ نہیں ہے — صرف ہندوستانیوں کی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ اس کے علاوہ دبلے پتلے عرب گداگروں کے ہجوم ہوتے ہیں۔'' اس نے انہیں بحیرۂ احمر تک انتظار کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''وہ اسے دیکھ کر مسحور ہو جائیں گے۔''

اور اس کی بات سچ تھی۔ بحیرۂ احمر کسی جھیل کی طرح پرسکون تھا۔ جہاز کے اردگرد ڈالفن مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ چاندنی راتوں میں عرشے پر مے نوشی اور رقص کی محفلیں برپا کی گئیں۔ ان محفلوں کی یادیں آئندہ کئی برسوں تک وکٹر کے ذہن میں تازہ رہیں۔

آسٹریلوی جوڑے نے اسمٰعیلیہ میں اتر جانا تھا۔ وہ اہرام دیکھنے کے بعد پورٹ سعید پر جہاز میں دوبارہ سوار ہو جاتے۔ ویلیری نے ان کی پیروی کرنے سے دیدہ دانستہ گریز کیا۔ اس نے وکٹر سے کہا: ''میں غیرمہذب مصری رہنماؤں کے ساتھ ان مقامات کی سیر کرنے کی بجائے تصویری کتابوں میں ان کی تصویریں دیکھنا پسند کروں گی۔ وہ ہم انگریزوں سے نفرت کرتے ہیں اور ہر سیاح سے اس کی آخری پینی تک بٹور لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نہر سویز سے گزرتے ہوئے لطف اندوز ہو گے۔ تم دیکھو گے کہ انگریزوں نے ان ناشکرے لوگوں کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔''
وکٹر نے اس کی غلطی پکڑتے ہوئے کہا: ''نہر سویز انگریزوں نے نہیں بلکہ فرانسیسی انجینئر ڈی لیسپ نے تعمیر کروائی تھی۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن سرمایہ تو انگریزوں نے لگایا تھا۔ یہ انگریز ہی ہیں، جو اس نہر سے جہازوں کی آمد ورفت کا اہتمام کرتے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ اس 72 میل لمبی تنگ نہر سے بحری جہازوں کو مصری یا فرانسیسی نہیں بلکہ انگریز جہازراں گزار کر لے جاتے ہیں۔''

نہر کا سفر بلاشبہ یاد رہ جانے والا تھا۔ اگرچہ وکٹر نے ویلیری کے سامنے اظہار تو نہیں کیا تاہم وہ دل میں انگریز جہاز رانوں کی تعریفیں کرتا رہا۔ نہر سے جہازوں کی لمبی قطاریں اتنے قریب سے گزر رہی ہوتی ہیں کہ تم ریلنگ پر جھکے بغیر پانی نہیں دیکھ سکتے۔ وکٹر کو یاد آیا کہ اس نے ایک کانگرسی رہنما سے اپنے باپ کو ملنے

والی کتاب میں پڑھا تھا کہ جنگ عظیم کے دوران نہر سویز کو ترکوں سے محفوظ رکھنے کے لیے انگریزوں نے ہزاروں ہندوستانی فوجیوں کو مصر بھیجا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ ویلیری کو بھی یہ بات بتائے لیکن پھر اس سوچ پر عمل نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے منظر دیکھتا رہا۔ جہاز نہر سے گزر رہا تھا۔ نہر کے دونوں کناروں سے پرے تاحد نگاہ تک بھورا صحرا پھیلا ہوا تھا۔ کہیں کہیں کھجور کے کچھ درختوں کے قریب جھونپڑیاں دکھائی دیں۔ ان کے علاوہ ہر طرف ریت اڑ رہی تھی۔ چند گھنٹوں بعد جہاز پورٹ سعید پہنچ کر لنگرانداز ہوا۔ جہاز نے یہاں ایندھن بھروانے اور کھانے پینے کی تازہ اشیا حاصل کرنے کے لیے آٹھ گھنٹے ٹھہرنا تھا۔ مسافروں کو خشکی پر اترنے کی اجازت دے دی گئی لیکن انہیں جہاز کی روانگی کے وقت سے ایک گھنٹہ پہلے واپس جانے کی ہدایت کی گئی تھی۔

ویلیری نے وکٹر کو خبردار کرتے ہوئے کہا: ''کسی پھیری والے سے کچھ مت خریدنا۔ یہ سب دھوکے باز اور غنڈے ہوتے ہیں۔ اگر تم کچھ خریدنا چاہتے ہو تو یہاں ایک بڑا ڈیپارٹمنٹ سٹور سائمن ارتز ہے۔ جہاں اشیا مقررہ قیمتوں پر ملتی ہیں۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ڈی لیسپ کے مجسمے کو ضرور دیکھتی۔ مجسمہ دیکھنے کے بعد ہم کسی باوقار ہوٹل میں چائے پی سکتے ہیں اور خوشی خوشی واپس آ سکتے ہیں۔''

ویلیری نے درست کہا تھا۔ وہ جونہی گینگ وے میں آئے' پھیری والوں نے انہیں گھیر لیا۔ وہ خوبصورتی سے پیک کی گئیں کھجوریں اور چاکلیٹ بیچ رہے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ فحش تصویروں والے پوسٹ کارڈ بیچ رہے تھے۔ ان تصویروں میں عورتوں کو مردوں کے علاوہ کتوں اور گھوڑوں کے ساتھ جنسی عمل میں مصروف دکھایا گیا تھا۔ وکٹر کو یہ دیکھ کر سخت کراہت محسوس ہوئی اور اس نے اپنی گورنیس کو ان غیر مہذب لوگوں سے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم اس کے بولنے سے پہلے ویلیری

نے پہل کی۔ وہ پہلے بھی ایسی صورتحال سے نبردآزما ہو چکی تھی۔ اس نے ہاتھ لہرا کر انہیں دفع ہو جانے کا اشارہ کیا۔ پہلے نرمی سے پھر سختی سے۔ آخر اس نے انہیں گالی دی۔ وکٹر نے اس سے پہلے کبھی اس کی زبان سے گالی نہیں سنی تھی۔

ایک فحش پوسٹ کارڈ بیچنے والے نے اسے جواباً گالی دی اور بولا: ''موٹے کولہوں والی کتیا! دفع ہو جاؤ۔''

''غلیظ'' ویلیری نے کہا' اس کا چہرا سرخ ہو گیا تھا۔

''اگر تو ایک لفظ بھی مزید بولا تو میں تیرے دانت توڑ دوں''۔ وکٹر نے غصے سے کہا۔

پوسٹ کارڈ والا بولا: تم توڑو گے میرے دانت؟ تم کالے ہندوستانی ٹوڈی۔ آؤ میں تم دونوں کو دکھاتا ہوں کہ میرے پاس کیا ہے۔'' یہ جملہ اس نے اپنے عضوِ تناسل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

ویلیری کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ اس آدمی کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھی۔ وکٹر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آخر وہ پھیری والوں سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئے اور ڈی لیسپ کے مجسمے کے طرف جانے والے طویل راستے پر گامزن ہو گئے۔ وہ گفتگو کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ انہوں نے کسی ریستوراں میں چائے نوشی کی بجائے واپس جہاز پر جانے کا فیصلہ کیا۔ جو مسافران سے پہلے جہاز پر واپس آ گئے تھے یا جہاز پر ہی رہے تھے' وہ پھیری والوں سے اشیا خریدنے کے لیے مول تول کر رہے تھے۔ ویلیری نے انہیں سمجھایا: ٹوکریوں میں اوپر والی کھجوریں یا چاکلیٹ اچھی ہوں گی لیکن نیچے لکڑیوں کا برادہ بھرا ہو گا۔ میں یہاں پہلے آ چکی ہوں' اس لیے میری بات پر یقین کرو۔'' اس کی بات مان کر کسی مسافر نے خریداری نہیں کی۔ پھیری والے انہیں گالیاں بکنے لگے۔

ایک مصری شعبدہ باز کو جہاز پر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس نے اپنی ٹوپی میں سے چوزے نکال کر دکھائے تو سب نے تالیاں بجا کر اسے داد دی۔ سب نے اسے تھوڑی بہت بخشش دی۔

ویلیری ناک چڑھاتے ہوئے بولی: ''یہ ان بے چارے چوزوں پر ظلم ہے۔ یہ سب کل تک مر جائیں گے۔''

جب جہاز کی روانگی کا سائرن بجا تو اس نے سکون کا سانس بھرا۔

وکٹر بولا: ''ویلیری ایسا لگتا ہے تم مصریوں کو پسند نہیں کرتی ہو۔''

''یہ نفرت انگیز ہوتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں' باہر کیا ہوا تھا؟''

وکٹر مصریوں کا بیہودہ رویہ دیکھ چکا تھا لیکن اسے یہ بھی پتا تھا کہ بعض ہندوستانی مردوں کا رویہ ایسے حالات میں مصریوں کے بیہودہ رویے سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ اس نے سوچا کیا وہ ہندوستانیوں کو بھی نفرت انگیز سمجھتی ہے؟ تاہم اس نے یہ سوچ کر اپنے ذہن سے نکال دیا۔ آسٹریلوی جوڑے کے پاس سنانے کو ایک مختلف کہانی تھی۔ وہ اہرام کی سیر سے بہت لطف اندوز ہوئے تھے اور مصری رہنماؤں کی بڑی تعریفیں کر رہے تھے۔

''دنیا کی سب سے قدیم تہذیب'' آسٹریلوی عورت بولی ''ہمارے رہنما انتہائی مہذب' باتمیز اور خوبصورت تھے۔ اگر تم مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گی کہ جتنی پرانی تہذیب ہوتی ہے' لوگ اتنے ہی مہذب ہوتے ہیں۔''

ویلیری نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات نہ سنی ہو۔ وہ بولی: ''چلو کھانا کھاؤ۔ ہم اس وقت بحیرۂ روم میں سفر کر رہے ہیں۔ اس کے شمالی ساحلوں پر زیادہ مہذب لوگ آباد ہیں — یونانی' اطالوی' فرانسیسی' ہسپانوی۔''

آسٹریلوی عورت کو اس کی بات مزاحیہ لگی اور وہ ہنسنے لگی۔ ''عرب تو بڑے

وحشی ہیں نا!'' اس نے کہا اور وکٹر کو آنکھ ماری۔

جب وکٹر نے جواباً آنکھ ماری تو خود بھی حیران رہ گیا۔ اسے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بڑا بڑا سا محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ جن سمندروں سے گزر کر آئے تھے ان سب سے زیادہ نیلے پانیوں والے بحیرۂ روم سے گزرے۔ جہاز جبل الطارق کا چکر کاٹ کر انگلش چینل کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاز ساؤتھیمپٹن میں لنگر انداز ہوا۔ انہوں نے آسٹریلوی جوڑے کو الوداع کہا اور بوٹ ٹرین کے ذریعے لندن روانہ ہو گئے۔

چوتھا باب

ریورنڈ تھامس بوٹوملی ہیرو آن دی ہل کے اینگلیکن چرچ کا پادری تھا۔ اس نے وکٹر سے کہا: ''اگر تم ایٹن کی بجائے ہیرو میں ہوتے تو سب کے لیے سہولت رہتی۔ تم ہفتہ وار چھٹیاں ہمارے ساتھ گزار سکتے تھے۔ ایٹن یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔ جس روز تم نے جانا ہوگا' میں تمہیں کار پر لے جاؤں گا۔''

اس کا گھر چرچ کے ساتھ تھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا قبرستان تھا' جہاں مردے صنوبر کے پرانے درختوں کے درمیان سوئے ہوئے تھے۔ چرچ سکول کو جانے والی سڑک سے کافی دور تھا۔ یہاں لوگ صرف اتوار کے دن صبح اور شام کے وقت عبادت کے لیے آتے تھے۔ باقی دنوں میں وہ ساتھ والے قبرستان کی طرح ویران رہا کرتا تھا۔ پادری تھامس کا گھر چھوٹا تھا۔ اس میں تین بیڈروم' ایک سٹنگ' ڈائننگ روم اور ایک لائبریری تھی۔ ویلیری اور اس کی دو بہنوں کو ایک بیڈروم میں سونا پڑا جبکہ ایک بیڈ روم وکٹر کو دے دیا گیا۔ اس نے پہلی سہ پہر اپنے والدین کو خط لکھنے میں گزاری۔ اس نے باپ کو انگریزی میں سفر کا احوال لکھا' برطانوی تسلط کے حوالے سے مصریوں کی ناپسندیدگی کے بارے میں بتایا۔ اس نے ماں کو خط ہندی میں لکھا۔ برطانوی تسلط کے حوالے سے مصریوں کی ناپسندیدگی کے بارے میں بتایا۔ اس نے ماں کو خط ہندی میں لکھا۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ کن کن لوگوں سے مل چکا

ہے اور یہ کہ ویلیری کا خاندان کتنا اچھا ہے۔ ویلیری کی ایک بہن وکٹر کو نزدیکی ڈاک خانے لے گئی جہاں اس نے اپنے باپ کو ٹیلیگرام کے ذریعے انگلستان خیریت کے ساتھ پہنچنے کی اطلاع دی۔

رات کا کھانا وکٹر نے افرادِ خانہ کے ساتھ کھایا۔ ویلیری کی گھر بخیر واپسی کی خوشی میں خصوصی ترکی کھانا تیار کیا گیا تھا۔ انہوں نے کھانے سے پہلے سر جھکا کر دعا کی۔ وہ اس گھرانے کا ایک خوشگوار اکٹھ تھا۔ وکٹر کو بڑی خوشی محسوس ہوئی۔ ویلیری کے باپ نے پورٹ شراب کی بوتل کھولی۔ سب نے دو دو جام پیے۔ وکٹر نے بھی شراب پی۔ شراب نوشی کے دوران پادری تھامس افریقہ میں مشزی کی حیثیت سے گزرے اپنی نوجوانی کے دنوں کی کہانیاں سناتا رہا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ وکٹر ان کے ساتھ صبح کی عبادت میں شریک ہوا۔ جب ویلیری دہلی میں تھی تو وہ کشمیری گیٹ میں واقع سینٹ جیمز چرچ میں عبادت کرنے اور کرسمس منانے جایا کرتی تھی لیکن اس نے کبھی وکٹر یا مٹو گھرانے کے کسی دوسرے فرد کو اپنے ساتھ چلنے کا نہیں کہا تھا۔ وکٹر نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی چرچ کو اندر سے دیکھا' مذہبی اجتماع کو گاتے اور ریورنڈ بوٹوملی کو وعظ دیتے سنا۔ وہ کسی چیز سے متاثر نہیں ہوا۔ اس کی معلومات میں فقط اتنا اضافہ ہوا کہ کسی چرچ کے اندر کیا ہوتا ہے۔

اگلے دن ویلیری وکٹر کو بس کے ذریعے نائٹس برج میں ہیرڈز لے گئی۔ وہاں سے وکٹر کے لیے اونٹ کے بالوں کا ایک ڈریسنگ گاؤن' اونی جرابیں' ایک برساتی کوٹ اور ایک چھتری خریدی گئی۔ اس کی سکول یونیفارم اور ہیٹ سکول کے سٹور سے خریدے جانے تھے۔

تیسرے دن ویلیری اور اس کی بہنیں وکٹر کو سیر کرانے لے گئیں۔ وہ ایک

ٹورسٹ بس میں سوار ہو گئے۔ بس انہیں سیاحوں کے لیے دلکشی رکھنے والے لندن کے تمام اہم مقامات پر لے گئی۔ ان میں بکنگھم پیلیس' ایوان ہائے پارلیمان' ویسٹ منسٹر ایبے' ٹرافالگر سکوائر' سینٹ پال کیتھڈرل' ٹاور آف لندن' برٹش میوزیم اور ٹیٹ گیلری شامل تھے۔ بھوک لگی تو انہوں نے سینڈوچ کھائے۔ چائے انہوں نے کیو گارڈنز میں پی۔ وہ ایک طویل تھکا دینے والا دن تھا۔ ''میں نے لندن میں رہتے ہوئے پہلے کبھی ان مقامات کو نہیں دیکھا تھا۔ تھینک یو وکٹر۔ اب میں تمہارے خاندان کو ان کے بارے میں بتا سکتی ہوں۔''

ایسا پہلی مرتبہ تھا کہ ویلیری نے ہندوستان واپسی کے منصوبے کا اظہار کیا ہو۔ ''کیا تم دوبارہ جا رہی ہو؟'' اس کی ایک بہن نے حیرت سے پوچھا۔ ''ہمارا تو خیال تھا کہ تم ہمیشہ کے لیے واپس آ گئی ہو' شادی کر لو گی اور یہیں رہو گی۔''

ویلیری ہنسنے لگی: ''میں نے تین مہینے کی چھٹیاں لی تھیں۔ مجھے ابھی وکٹر کی بہنوں کو پڑھانا ہے۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔''

''یاد رکھنا مام اور ڈیڈ اسے پسند نہیں کریں گے۔ کیا تم نے انہیں بتایا ہے؟''

''نہیں ابھی نہیں بتایا۔ میں اپنے سہارے جینا چاہتی ہوں۔ وکٹر کا باپ چاہتا ہے کہ اس کے لیے وسطی لندن میں کہیں کوئی چھوٹا سا فلیٹ حاصل کر لیا جائے' جہاں وہ چھٹیوں کے دوران رہ سکے۔ میں اس کے لیے مے فیئر یا ہائیڈ پارک کے نزدیک ماربل آرک یا کینسنگٹن گارڈن میں کوئی فلیٹ ڈھونڈوں گی۔ میں ہندوستان واپسی تک وہیں رہوں گی۔''

ویلیری کی بہنوں نے اپنے والدین کو اس کے منصوبوں سے آگاہ کیا تو وہ بہت اداس ہو گئے۔ اس کی ماں بولی: ''اس کی اپنی زندگی ہے' وہ اپنی پسند کے مطابق ہی اسے گزارے گی۔ اگر وہ انگلینڈ کی بجائے ہندوستان میں رہنا چاہتی ہے

تو ٹھیک ہے۔"

ریورنڈ بوٹو ملی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اپنی بیٹی کو جانتا تھا اور اسے شبہ تھا کہ اس کی ہندوستان واپسی کا سبب کوئی اور ہے۔ سبب کوئی اور تھا لیکن اسے نہ کھوجنا ہی بہتر تھا۔

ویلیری نے چند ہی دنوں میں البیئن سٹریٹ کے پیچھے ایک چھوٹا سا فلیٹ ڈھونڈ لیا۔ اس میں ایک چھوٹا سا بیڈروم' چھوٹا سا باورچی خانہ اور چھوٹا سا ہی غسل خانہ تھا۔ کرایہ معقول تھا۔ اس نے فلیٹ اپنے نام سے چھ سال کے لیے لیز پر لے لیا۔ اس علاقے کے لوگ اپنی عمارتیں رنگ دار افراد کو کرائے پر دینے سے ہچکچاتے تھے۔ تاہم ان کے سفید فام کرایہ دار عمارت کسی رنگ دار فرد کو کرایہ پر دے دیں تو اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔

ویلیری نے وکٹر کو وہ فلیٹ دکھایا۔ وکٹر کو فلیٹ پرسکون ہونے کی وجہ سے بہت پسند آیا۔ ایک چھوٹے سے الیکٹرک ریڈی ایٹر نے پورے فلیٹ کو گرم کر رکھا تھا۔ ویلیری نے اسے اردگرد گھما کر دکھایا کہ وہ اپنے لیے ڈبل روٹی' مکھن' پنیر اور کھانے پینے کی دیگر اشیا کہاں کہاں سے خرید سکتا ہے۔ وہ اسے سپیکرز کارنر لے گئی جہاں انہوں نے خدا کی عظمت بیان کرنے والوں کے ساتھ ساتھ چرچ اور برطانوی استعمار کے خلاف آگ اگلنے والوں کی تقریریں سنیں۔ ویلیری نے وکٹر سے کہا: "یہ ایک عظیم ادارہ ہے۔ تم اپنی پسند کے کسی بھی موضوع پر اپنے دل کا غبار نکال سکتے ہو اور کوئی پروا بھی نہیں کرے گا۔ یہ ایک آزاد ملک ہے۔ یہاں ہر کسی کو اپنی پسند ناپسند کے اظہار کی آزادی ہے۔"

"ہم نے ایسی آزادی ہندوستان میں تو نہیں دیکھی" وکٹر نے کہا اور ہنسنے لگا۔ "مسخرہ پن مت کرو" ویلیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں ہوئی کیونکہ ان دونوں کو بحث مباحثہ پسند نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک دوسرے کو انگریز یا ہندوستانی کی حیثیت سے نہیں دیکھتے تھے۔

اگلی صبح انہوں نے بیس واٹر روڈ سے ناٹنگ ہل گیٹ تک پیدل سیر کی۔ وہاں فٹ پاتھوں پر بے شمار بنی ٹھنی عورتیں گھوم پھر رہی تھیں۔ ان کو دیکھ کر تیرہ سالہ وکٹر بھی بتا سکتا تھا کہ وہ کسی اچھے مقصد سے نہیں گھوم پھر رہیں۔

ویلیری نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا: ''کبھی ان میں سے کسی کے ساتھ بات کرنے کے لیے مت رکنا۔ یہ پست ترین عورتیں ہیں۔''

وکٹر نے وعدہ کیا کہ وہ کبھی ایسی عورتوں سے بات نہیں کرے گا۔

تین دن بعد ریورنڈ بوٹوملی اور ویلیری وکٹر کو ایٹن کے ہیڈ ماسٹر کے حوالے کرنے لے گئے۔ ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔

''مجھے یقین ہے کہ یہ یہاں خوش رہے گا'' ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ ''ہم اس کا پورا خیال رکھیں گے۔''

اس نے انہیں سکول کی سیر کروائی اور وہ کمرہ دکھایا جہاں وکٹر نے پانچ دوسرے لڑکوں کے ساتھ رہنا تھا۔ وہ اپنے کپڑے اور کتابیں الماریوں میں رکھ رہے تھے۔ ہیڈ ماسٹر نے وکٹر کا ان سے تعارف کروایا۔ اس کی چیزیں بستر پر رکھ دی گئیں۔

''میرا خیال ہے کہ ہم اسے اپنے روم میٹس کے ساتھ واقفیت پیدا کرنے کے لیے یہیں چھوڑ دیں۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

ریورنڈ بوٹوملی نے وکٹر سے ہاتھ ملایا۔ ویلیری نے اس کے دونوں رخساروں پر بوسہ دیا اور جذبات سے مغلوب رخصت ہوگئی۔

ہیڈ ماسٹر کی موجودگی کی وجہ سے اٹینشن کھڑے لڑکے ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑے ہو گئے۔ ”اچھا تو تم ہو وکٹر۔ یہ کیسا ہندوستانی نام ہے؟“ پانچوں میں سے سب سے بڑے لڑکے نے پوچھا۔

”میرا نام وکٹر جے بھگوان ہے۔ مختصراً وکٹر کہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بہت خوب، مختصراً وکٹر کہتے ہیں! تم میری خدمت کیا کرو گے۔ تمہیں میرے کپڑے استری اور جوتے پالش کرنا ہوں گے اور جو کچھ میں کہوں گا، کرنا ہو گا۔“

ویلیری وکٹر کو پہلے ہی ایسی صورتحال سے خبردار کر چکی تھی۔ درحقیقت وکٹر ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے ہی خیالوں ہی خیالوں میں ایسی باتوں کا جواب کئی مرتبہ دے چکا تھا۔ اس نے جھک کر کہا: ”یس سر، ہم ہندوستان میں ایک سو سال سے انگریزوں کے جوتے پالش کر رہے ہیں۔ مجھے انگلینڈ میں آپ کے جوتے پالش کر کے خوشی ہو گی۔“

”بڑے چالاک ہو تم!“ بڑے لڑکے نے حقارت سے کہا اور پھر بولا: ”اگر تم برا نہ مانو تو یہاں لواطت بھی ہو گی۔“

”کوئی بات نہیں، انگریزوں نے ہمیں اس کا بھی عادی بنا دیا ہے۔ وہ ہندوستانیوں سے بدفعلی کرواتے بھی ہیں۔“ وکٹر نے جواب دیا۔

اس کے بعد مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ چند دن بعد وکٹر بڑے لڑکے کے جوتے پالش کر رہا تھا اور بڑا لڑکا وکٹر کے۔ بدفعلی کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ وہ دونوں اکٹھے نہاتے اور زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کی ناف کے نیچے کے بال دیکھ لیتے تھے۔

وکٹر کو ایٹن میں زندگی کے معمولات متعین کرنے میں کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوا۔ وہ لاطینی سمیت تمام مضامین میں عمدہ کارکردگی دکھانے والے تین یا چار

لڑکوں میں سے ایک تھا۔ اگرچہ وہ عام بول چال والی انگریزی سے تو شناسا نہیں تھا تاہم اس کی کلاسیکی انگریزی اپنے انگریز ہم جماعتوں سے بہتر تھی۔ وہ بیرونی زندگی سے لطف اندوز نہیں ہوتا تھا' کیونکہ اسے سرد اور مرطوب آب و ہوا پسند نہیں آئی تھی۔ وہ سکول کے سارے کھیلوں میں حصہ لیتا لیکن رغبت سے نہیں۔ اسے گرم لائبریری میں بیٹھنا اخباروں اور رسالوں کی ورق گردانی کرنا زیادہ خوشی دیتا تھا۔

دسمبر کا مہینہ آ گیا اور لڑکے کرسمس اپنے گھر والوں کے ساتھ منانے کے منصوبے بنانے لگے۔ بڑا لڑکا چاہتا تھا کہ وکٹر سفلوک میں واقع ان کے گھر میں ان کے خاندان کے ساتھ کرسمس منائے۔ ویلیری چاہتی تھی کہ وہ کرسمس ہیرو آن دی ہل میں اس کے والدین کے ساتھ منائے۔ وکٹر نے دونوں دعوتوں کو نرمی سے رد کر دیا اور ویلیری سے پوچھا کہ کیا وہ اس کی عدم موجودگی میں کرسمس البیئن میوز میں اکیلا منا سکتا ہے۔ ویلیری کو کرسمس منانے اپنے والدین کے ہاں جانا تھا۔

''کرسمس اکیلے مناؤ گے؟'' اس نے پوچھا۔ ''عجیب انسان ہو تم۔ خیر میں تمہارے کھانے کے لیے تھوڑا سا ٹرکی کا سالن اور کرسمس پڈنگ رکھ جاؤں گی۔ بس انہیں گرم کرنا اور پورٹ وائن کی ایک بوتل کھول لینا۔ بی بی سی پر کنگز کالج چیپل سے کرسمس کا ایک بہت اچھا پروگرام نشر ہو گا۔ تم اس سے لطف اندوز ہونا۔''

کرسمس سے تین دن پہلے وکٹر صبح کی بس سے وسطی لندن روانہ ہو گیا۔ بس نے اسے ماربل آرک پر اتارا۔ وہاں سے البیئن میوز پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ ویلیری اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے فلیٹ کو رنگ برنگی جھنڈیوں' غباروں اور ایک چھوٹے سے کرسمس ٹری سے سجا دیا ہوا تھا۔ کرسمس ٹری میں چھوٹے چھوٹے بلب روشن تھے۔ اس نے وکٹر کے لیے دوپہر کا کھانا تیار کر رکھا تھا۔ انہوں نے دہلی فون کیا۔ وکٹر نے اپنے والدین اور بہنوں سے بات کی۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ

خیریت سے ہے اور خوب مزے کر رہا ہے۔

''مجھے یقین ہے کہ تم نے میرے ساتھ ہیرو چلنے کا تو فیصلہ نہیں کیا ہو گا؟ مجھے یقین ہے کہ تم انگلینڈ میں اپنی پہلی کرسمس اکیلے گزارنا چاہتے ہو؟'' ویلیری نے دوپہر کے کھانے کے بعد برتن دھوتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل''۔ وکٹر نے جواب دیا۔ ''میں لندن میں گھوموں پھروں گا اور دیکھوں گا کہ لوگ کس طرح خوشی منا رہے ہیں۔''

''تمہیں سڑکوں پر بہت کم لوگ ملیں گے۔ اچھے لوگ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہوں گے۔ مے کدوں میں بے شمار نشئی لوگ ہوں گے۔ سڑکیں پار کرتے وقت محتاط رہنا۔''

''میں اپنا خیال رکھوں گا' فکر مت کرو۔'' وکٹر نے کہا۔ ''میں باکسنگ ڈے کے بعد سکول واپس چلا جاؤں گا۔''

''میں بھی اسی شام یہاں آجاؤں گی۔ تمہیں کرسمس مبارک ہو اور اپنا خیال لازماً رکھنا۔'' اس نے اس کے دونوں رخساروں کو چومتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے گھر والوں کے لیے تحفوں کے پارسل اٹھائے اور رخصت ہو گئی۔

وکٹر آرم چیئر پر سکون سے بیٹھ گیا۔ ٹریفک کے شور اور لوگوں کی بے سروپا باتوں سے دور اکیلا ہونا نہایت خوشگوار تھا۔ وہ لوگوں سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ وہ تو انہیں پسند کرتا تھا۔ تاہم کبھی کبھار وہ ان سے اکتا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خود کو دوسروں سے برتر تصور کرتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایک خاص انسان ہے۔ وہ اس بات سے تب سے آگاہ تھا جب اس کی عمر پانچ سال تھی اور باپو گاندھی نے اسے اپنے گھٹنوں پر بٹھا کر پیشگوئی کی تھی کہ وہ ایک عظیم انسان بنے گا۔ تنہائی میں اسے اپنے برتر ہونے کا زبردست احساس ہوا۔ البین میوز میں گزری کرسمس

سے اس کی زندگی کے اس معمول کا آغاز ہوا کہ وہ زیادہ تر تنہا رہا کرے۔

اس نے باہر نکلنے سے پہلے تھوڑی دیر سونے کا فیصلہ کیا۔ وہ بستر پر لیٹا تو اسے سرہانے کے نیچے سے ایک چھوٹا سا پیکٹ ملا' جو سرخ ربن سے بندھا ہوا تھا۔ پیکٹ پر ایک کارڈ بھی چسپاں تھا' جس پر ایک سرخ ربن اور مقدس پتے بنے ہوئے تھے۔ کارڈ پر لکھا تھا: ''ویل (VAL) کی طرف سے کرسمس مبارک اور محبت۔''

اس نے پیکٹ کھولا۔ اس میں نیلی اور سفید دھاریوں والی ایک ریشمی ٹائی اور ریشمی رومال تھا۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اسے اچانک احساس ہوا کہ اسے بھی ویلیری کو کرسمس کا تحفہ دینا چاہیے تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نئے سال کی آمد پر اسے تحفہ دے گا۔

بعد میں شام کو وہ سپیکرز کارنر گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ آکسفورڈ سٹریٹ کی طرف چلا گیا۔ تمام دکانیں بقعۂ نور بنی ہوئی تھیں۔ سب دکانوں میں فادر کرسمس کو رینڈئیر والے چھکڑے سمیت سجایا گیا تھا۔ دکانیں آخری وقت میں کرسمس کی خریداری کرنے والوں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ ریجنٹ سٹریٹ کی طرف مڑ گیا۔ اس سڑک پر بہت کم لوگ تھے۔ پکاڈلی سرکس کے قریب ایروس کے مجسمے کے گرد بے شمار نوجوان لڑکے لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ لائیسیسٹر سکوائر سے گیرارڈ سٹریٹ کی طرف چلا تھا۔ لندن میں صرف دو ہندوستانی ریستوران ہیں' جو کہ اسی سڑک پر واقع تھے۔ وہ کئی ایسی سجی بنی عورتوں کے پاس سے گزرا جن کے بارے میں ویلیری نے اسے خبردار کیا تھا۔ کچھ طوائفوں نے اسے ورغلانے کی کوشش کی۔ ''کیا تم کچھ اچھا وقت گزارنا پسند کرو گے' پیارے؟'' ''تمہیں کرسمس کی رعایت ملے گی۔ صرف پانچ پونڈ۔'' اس نے انہیں نظر انداز کر دیا۔ اسے بڑا ہندوستانی ریستوران کوہِ نور نظر آیا تو وہ اس میں چلا گیا۔ کری اور مصالحوں کی مہک اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ اس نے

کئی ماہ سے ہندوستانی کھانوں کی مہک نہیں سونگھی تھی۔

اس نے ایک نشست سنبھالی اور مینیو کا جائزہ لیا۔ ہر پکوان کی قیمت بہت زیادہ رکھی گئی تھی۔ اس نے چپاتیوں، دال اور کری کا آرڈر دیا۔ ہندوستانی بیروں نے مسکرائے بغیر اس سے آرڈر لیا۔ وہ اسے ایک گاہک سے زیادہ کچھ نہیں تصور کر رہے تھے۔ اس بات پر اسے غصہ آ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ نوٹوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ان کے منہ پر مارے۔ ہوٹل میں بہت کم گاہک تھے: دو ہندوستانی گھرانے ہاتھوں سے کھانا کھا رہے تھے اور دو تین انگریز سکاچ پی رہے تھے۔ فضا دھندلی دھندلی سی تھی۔ وکٹر کو کھانے کا مزا صرف اس لیے آیا کہ وہ ہندوستانی کھانا تھا۔ میز پر کئی قسم کی چٹنیاں اور اچار رکھے گئے تھے۔ اس نے ان کے ساتھ دال کھائی۔ اسے اتنا مزہ آیا کہ اس نے سوچا پیسے پورے ہو گئے ہیں۔

وہ جس راستے سے آیا تھا، اسی سے واپس چلا گیا۔ دکانوں کے شٹر گرا دیئے گئے تھے۔ موسم سرد ہو گیا تھا۔ سڑکوں پر اور گلیوں میں بہت کم لوگ تھے۔ صرف طوائفیں گاہکوں کے انتظار میں ٹہل رہی تھیں تا کہ کہیں گرم گرم کھانا کھا سکیں۔

کرسمس کے دن لندن حیران کن انداز میں پرسکون تھا۔ ٹریفک کی آواز بمشکل سنائی دی۔ گرجا گھروں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ وہ ایک روشن صبح تھی۔ وکٹر ہائیڈ پارک میں تھوڑی دیر ٹہلتا رہا۔ وہاں بہت کم لوگ تھے۔ سپیکرز کارنر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ روٹن رو پر مرد اور عورتیں گھوڑوں پر سوار گھوم رہے تھے۔ یہ واحد سرگرمی تھی جو اس نے دیکھی۔ وہ سرد فضا میں دو گھنٹے تک پھرتا رہا۔ جن جگہوں کی اس نے سیر کی انہیں عام طور پر لندن کے پھیپھڑے کہا جاتا تھا۔ جب وہ بیس واٹر سے البین سٹریٹ پہنچا تو تھک چکا تھا اور اسے بھوک لگی ہوئی تھی۔ فلیٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے گیس سٹوو جلایا اور پلیٹ بھر کر ٹرکی اوون میں رکھ دیا۔ ٹرکی گرم

ہونے کے دوران اس نے پورٹ وائن کی بوتل کھولی اور ایک گلاس بھر لیا۔ شراب مزیدار تھی۔ اسے پینے سے اس کے اندر حرارت دوڑ گئی۔ اس نے شراب سے ایک گلاس بھر کر پیا۔ اسے ہلکا ہلکا سرور محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے گرم گرم ٹرکی مزے لے لے کر کھایا۔ کھانے کے بعد اس نے پلیٹ' کانٹا اور چاقو دھویا اور بستر پر لیٹ کر ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ راستے میں اس نے موڑ پر واقع دکان سے شام کا اخبار خریدا تھا۔ وہ ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اخبار پڑھنے لگا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے اس کو نیند آنے لگی۔ وہ ٹیبل لیمپ بجھائے بغیر سو گیا۔

اسے گہری' خوابوں سے خالی نیند آئی۔ گرجا گھروں کی گھنٹیوں کی زوردار آواز نے اسے جگا دیا۔ وہ یقیناً تین گھنٹے سویا ہو گا۔ شراب اور تنہائی نے اسے آسٹریلوی عورت یاد دلا دی۔ اسے اپنی ران پر اس کے ہاتھ کی گرمی محسوس ہونے لگی۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا اس کے سرخ ہونٹوں اور سفید چھاتیوں کو تصور میں دیکھتا رہا۔ رفتہ رفتہ یہ تصور ماند پڑ گیا اور اس کا ذہن گیرارڈ سٹریٹ کی اس طوائف کی طرف مڑ گیا جس نے اسے پانچ پونڈ کے بدلے اپنے ساتھ اچھا وقت گزارنے کی دعوت دی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ کیا کرتی؟ وہ اپنے اور اس کے کپڑے اتار دیتی — اور پھر کیا ہوتا؟ اسے پکا پتا نہیں تھا تاہم امکانات نے اس کے عضو تناسل کو درد آمیز ایستادگی عطا کی۔ وہ کچھ دیر اپنے ساتھ محظوظ ہوتا رہا۔ پھر اس نے مزید کچھ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مشت زنی سے بچنے کے لیے ایٹن کے طلبا والا نسخہ آزمایا۔ اس نے غسل خانے میں جا کر ایستادہ عضو تناسل پر تین چار جگ ٹھنڈا پانی ڈالا۔ ٹھنڈے پانی کے اثر سے ایستادگی ختم ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ پارک میں دوبارہ سیر کرنے سے اس کا ذہن بری خواہشات سے پاک ہو جائے گا۔

اس نے نہانے کے بعد چائے پی' فلیٹ کو گرم کرنے کے لیے ریڈی ایٹر کو

جلتا رہنے دیا اور دوبارہ باہر نکل گیا۔ شہر صبح کی نسبت زیادہ ویران سا دکھائی دے رہا تھا۔ سپیکرز کارنر سے لے کر سرپینٹین تک اسے کوئی ایک فرد بھی نہیں ملا۔ تمام کشتیاں زنجیروں سے بندھی ہوئی تھیں۔ اردگرد کوئی ملاح نہیں تھا۔ کچھ بوڑھی عورتیں اپنے اردگرد پھرنے والی بطخوں وغیرہ کو ڈبل روٹی کے ٹکڑے ڈال رہی تھیں۔ اس کے علاوہ سارا علاقہ سنسان پڑا تھا۔

وکٹر اپنے فلیٹ کی طرف واپس ہو لیا۔ ناٹنگ ہل گیٹ سے وہ ماربل آرک جانے کے لیے بیس واٹر روڈ پر چلنے لگا۔ اس سڑک پر نہ تو ٹریفک تھی اور نہ ہی فٹ پاتھوں پر کوئی پیدل چل رہا تھا۔ ماربل آرک کے نزدیک اسے رین کوٹ پہنے ہوئے ایک شخص دکھائی دیا' جس نے ایک گندا سا مفلر گلے میں لپیٹا ہوا تھا۔ وہ ایک عورت تھی۔ جونہی وہ اس کے قریب پہنچا وہ اس کی طرف مڑی اور بولی: ''ہیلو'' وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔

''ہیلو'' وکٹر نے جواب دیا۔ ''تم اتنی سرد رات میں باہر کیا کر رہی ہو؟''

وہ بیس اکیس سال کی لگتی تھی۔ سردی سے اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

''میں اپنا کرسمس ڈنر کمانے کا انتظار کر رہی ہوں' اور میں نے کیا کرنا ہے۔ کیا تم مجھے ڈنر کروا دو گے؟ صرف پانچ پونڈ لگیں گے۔''

وکٹر جواب دینے سے پہلے کچھ دیر چپ رہا۔ اسے لڑکی پر رحم آ رہا تھا۔ وہ اس سرد ماحول میں بالکل اکیلی کھڑی تھی۔ ''آؤ میں تمہیں اپنے فلیٹ میں عمدہ ٹرکی ڈنر اور کرسمس پڈنگ کھلاتا ہوں۔ تمہاری ایک پینی بھی خرچ نہیں ہو گی۔''

لڑکی نے وکٹر کو پیار سے دیکھا۔ اس کی عمر اتنی کم تھی کہ وہ جسم فروش نہیں لگتی تھی۔ وکٹر نے رنگ دار ہونے کے باوجود ایک مہذب جنٹل مین کا سا رویہ اپنایا۔ لڑکی نے اس کا بازو تھاما اور بولی: ''تو پھر چلو۔ میرا نام جینی ہے۔''

اس کے ہاتھ ٹھنڈے یخ تھے۔ جب وہ چل رہے تھے تو وہ مسلسل کانپ رہی تھی۔ وکٹر اسے اپنے فلیٹ میں لے گیا۔ ''او! یہ تو بہت آرام دہ اور کسی ٹوسٹ کی طرح گرم ہے۔''

اس نے اپنا سکارف اور رین کوٹ اتار کر آرم چیئر پر رکھ دیئے اور گیس کی آگ تاپنے لگی۔ ''کیا تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔''ہاں۔ جب میں سکول میں نہیں ہوتا تو یہاں رہتا ہوں۔ یہ میری پناہ گاہ ہے۔''

''یہ خوب گرم ہے۔ محبت کرنے کے لیے بہترین جگہ ہے یہ۔''

وکٹر نے اس کے جملے کا آخری حصہ نظرانداز کر دیا۔ حالانکہ اس کی بات سنتے ہی اس کا عضو تناسل ایستادہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ بولا: ''یہ شراب کے گلاس کی طرح تمہیں گرم کر دے گا۔''

''بہت خوب'' وہ بولی۔ ''تم بہت اچھے لڑکے ہو۔ تمہیں اپنا وقت اور پیسہ طوائفوں پر ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

وکٹر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے بچا کھچا ٹرکی اور کرسمس پڈنگ اوون میں رکھ کر ریڈیو چلا دیا۔ کرسمس کا خصوصی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ جینی گانا سن کر خود بھی گانے لگی۔

جینی نے دو افراد کے لیے میز لگائی اور ٹرکی اور کرسمس پڈنگ برتنوں میں ڈالے۔ انہوں نے ڈنر کے ساتھ مزید پورٹ پی۔ کھانے کے بعد جینی نے برتن دھوئے۔ وکٹر سوچ رہا تھا کہ وہ خود وہاں سے چلی جائے گی یا اسے کہنا پڑے گا۔ وہ اس کا موڈ بھانپ گئی۔

''کیا تم میرے ساتھ محبت کرنا پسند کرو گے؟ میں تم سے پیسے نہیں مانگوں گی۔ تم نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا ہے۔ میں تو سردی میں مر ہی گئی تھی۔''

وکٹر نے اس کے پہلے سوال کا جواب نہیں دیا' تاہم بولا: ''کیا گھر نہیں جاؤ گی۔ بہت دیر ہو چکی ہے۔''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ پلیز مجھے رات کو یہیں رہنے دو۔ اگر تم مجھ سے محبت کرنا چاہو تو میں تمہیں خوب لطف دوں گی۔ اگر تم محبت نہیں کرو گے تو بھی اچھا ہو گا۔ لیکن خدا کے لیے مجھے باہر مت نکالو۔ میں کہیں فٹ پاتھ پر پڑے پڑے سردی سے مر جاؤں گی۔ پلیز!'' اس نے بانہیں وکٹر کی گردن کے گرد ڈال دیں اور منتیں کرنے لگی' ''پلیز' صرف آج رات کے لیے۔ میں تمہیں دوبارہ تنگ نہیں کروں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔''

وکٹر کا دل پسیج گیا۔ ''او کے۔ تم بستر پر سو جاؤ۔ میں صوفے پر سو جاؤں گا۔''

''او تھینک یو!'' اس نے خوش ہو کر اس کے ہونٹ چوم لیے۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں تنگ نہیں کروں گی۔ میں صبح چلی جاؤں گی۔''

وکٹر نے پاجامہ پہنا۔ اس کے پاس اوڑھنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے اس نے گیس کی آگ کو روشن رکھنے کا فیصلہ کیا۔ جینی نے اپنے سارے کپڑے اتار دیئے اور بالکل ننگی ہو گئی۔ کپڑے اس نے بستر کے سرہانے رکھ دیئے اور وکٹر سے بولی: ''اگر تمہیں سردی لگے تو بستر پر میرے ساتھ لیٹ جانا۔''

وکٹر نے اس پر نگاہ ڈالی۔ اسے نسوانی جسم کو دیکھنا اچھا لگ رہا تھا لیکن وہ اسے بہت مہذب انداز سے تک رہا تھا۔ جینی بستر پر لیٹ گئی۔ وکٹر صوفے پر لیٹ گیا۔ اس نے بتیاں بجھا دیں تھیں۔ چند منٹ بعد اسے جینی کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ اسے نیند نہیں آئی۔ وہ تصور ہی تصور میں اس کے ساتھ ننگا لیٹنے کا منظر دیکھتا رہا۔ اسے اس کی چھاتیاں اپنے چہرے سے ٹکراتی محسوس ہوئیں۔ ایک ننگی لڑکی اس کے بستر میں لیٹی ہوئی تھی' اس کے ساتھ محبت کرنے کے لیے مکمل طور پر تیار تھی

اور وہ اس سے صرف چند فٹ دور ایک صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ کیا وہ بزدل تھا؟ کیا وہ گدھا تھا؟ شہوت اس کے خوف پر غالب آ گئی۔ وہ ایک دم اٹھ گیا اور ننگا ہو کر طوائف کے ساتھ لیٹ گیا۔

''صوفے پر سردی لگ رہی ہے۔'' اس نے بہانہ بنایا۔ تاہم اس کا ایستادہ عضو تناسل دوسری کہانی کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں بستر میں زیادہ حرارت ملے گی۔ آؤ اور میرے اوپر لیٹ جاؤ۔'' جینی بولی۔

وکٹر نے اس کی بات پر عمل کیا۔ اس نے وکٹر کے لیے اپنی ٹانگیں کھول دیں۔ اپنے آپ کو قابو میں ظاہر کرنے کو مضطرب وکٹر اس کے اوپر بے حرکت لیٹ گیا' حالانکہ اس کے پھیپھڑے پھٹے جا رہے تھے۔ جینی نے اپنی ٹانگیں اس کی کمر کے گرد لپیٹ دیں اور اس کا عضو تناسل اپنی اندام نہانی میں داخل کر لیا۔ وکٹر کا سانس زور زور سے چلنے لگا۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ جنسی عمل اس قدر راحت انگیز ہو سکتا ہے ـــ اس کا جسم پاؤں کے ناخنوں سے لے کر سر کے بالوں تک سرور و کیف میں ڈوب گیا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ اس کے مزید بازو ہوتے جن سے وہ لڑکی کے جسم کو بھینچتا اور ایک اور منہ ہوتا جس سے وہ بیک وقت اس کی دونوں چھاتیوں کو چوستا۔ یہ اس کا پہلا جنسی ملاپ تھا' جو ایک منٹ میں اختتام پذیر ہو گیا۔ خلاص ہونے سے پہلے اس کا سارا بدن تن گیا تھا اور جونہی لاوا خارج ہوا' وہ ڈھیلا ڈھالا سا پڑ گیا۔ ''تم تو بہت جلدی ختم ہو گئے۔'' جینی بولی۔ ''لیکن فکر مت کرو' پہلی بار ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔''

آدھے گھنٹے بعد وکٹر مزید جنسی عمل کے لیے تیار تھا۔ اس مرتبہ جینی نے ٹانگیں اس کے کندھوں پر رکھ دیں۔ وہ ہر دھکے کے ساتھ مزید گہرائی میں اترتا گیا اور زیادہ دیر تک برقرار رہا۔ دو گھنٹے بعد وہ پھر جنسی عمل کر رہے تھے۔ اس مرتبہ جینی

پر جنون طاری ہو گیا۔ وہ اسے دانتوں سے کاٹنے اور ناخنوں سے خراشیں لگانے لگی اور اسے شدت سے کام لینے کا کہنے لگی۔ وکٹر نے اس کی بات پر پورا پورا عمل کیا۔

تو یوں وکٹر جے بھگوان نے چودہ سال کی عمر میں ایک بے گھر جسم فروش لڑکی جینی کے ساتھ اپنا کنوار پن کھویا۔ جنسی عمل کے بعد وہ گہری نیند سو گیا تھا۔ ایسی گہری نیند اسے پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔

اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب جینی چھوٹے سے باورچی خانے میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ اس نے ایسا ظاہر کیا جیسے سو رہا ہے۔ اس طرح وہ اسے الوداع کہنے کے بیہودہ مرحلے سے بچ گیا۔ اس نے اسے رین کوٹ پہنتے' سیڑھیاں اترتے' بیرونی دروازہ کھولتے اور اسے زور سے بند کرتے سنا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے سکون کا سانس لیا اور دوبارہ گہری نیند سو گیا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ ''کرسمس مبارک ہو!'' دوسری طرف سے ویلیری کی خوشی سے بھرپور آواز آئی۔ ''سناؤ کیسی گزری تمہاری گزشتہ شام؟''

''کرسمس مبارک'' وکٹر نے جواباً مبارک دی۔ ''بہت عمدہ۔ میں ٹرکی اور پڈنگ اور وائن سے خوب لطف اندوز ہوا۔ میں نے بی بی سی سے کرسمس کا خصوصی پروگرام سنا۔ اس سے عمدہ پروگرام کوئی نہیں ہو سکتا۔ میری طرف سے اپنے والدین اور بہنوں کو کرسمس کی مبارک دے دو۔''

وہ فون سننے کے بعد صوفے پر واپس آیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی دوبارہ بجنے لگی: ''مسٹر وکٹر کے لیے طویل فاصلے کی کال ہے'' آپریٹر نے کہا۔

''میں وکٹر ہوں۔ پلیز کال ملا دو۔''

یہ اس کا باپ تھا' جو دہلی سے بات کر رہا تھا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''لندن میں تنہا مزے کر رہا ہوں۔ ماں کیسی ہے؟ اور لڑکیوں کا کیا حال ہے؟''

''لو ان سے بات کرو۔''

اس نے باری باری ان سے باتیں کیں۔ جلد ہی تین منٹ گزر گئے اور فون کال ختم ہو گئی۔

وہ غسل خانے جا کر نہایا اور دوبارہ لباس پہنا۔ اس نے اپنے ٹراؤزر کی ہپ پاکٹ کو چھو کر دیکھا۔ وہ اس میں اپنا پرس رکھا کرتا تھا۔ جیب خالی تھی۔ پرس میں پندرہ پونڈ تھے۔ اس نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ اس کا ایٹن کا اونی سکارف بھی غائب تھا۔ وہ صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''کتیا! اس نے مجھ سے اپنا معمول کا معاوضہ وصول کر ہی لیا — ایک مرتبہ کے پانچ پونڈ۔'' وہ بڑبڑایا۔

اس کے پاس اتنے بھی پیسے نہیں رہے تھے کہ ایٹن واپس چلا جائے۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ بس کا کرایہ کہاں سے لائے؟

اس نے کرسمس کا دن اپنے فلیٹ میں مطالعہ کرتے اور ریڈیو سنتے ہوئے گزارا۔ وہ ویلیری کو اپنے کنگال ہو جانے کی اطلاع دے کر اس کی کرسمس کی خوشی غارت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اگلے دن — باکسنگ ڈے کی صبح کو اسے فون کیا۔

''ویلیری میری جیب کسی پرہجوم سڑک پر کاٹ لی گئی ہے۔ کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے سکتی ہو تاکہ میں بس کا کرایہ ادا کر کے سکول پہنچ سکوں۔''

وہ اس کی بات سن کر پریشان ہو گئی۔ ''افسوس! تمہیں پرہجوم جگہوں پر بہت محتاط رہنا چاہیے۔ یہ علاقے تو چوروں اور جیب کتروں سے بھرے پڑے ہیں۔ کیا تم کل تک گزارا کر سکتے ہو؟ میں تمہیں خود بس پر چڑھاؤں گی۔''

''مجھے فی الوقت پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں سب کچھ ہے۔ ہاں کل پیسوں کی ضرورت ہو گی۔'' اس نے جواب دیا۔

اس نے ریسیور رکھ دیا اور فیصلہ کیا کہ ایٹن میں لڑکوں کو جینی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتائے گا۔ اگر انہیں پتا چل جاتا ہے کہ اسے ایک طوائف نے لوٹ لیا تھا وہ ہمیشہ اس کا مذاق اڑاتے اور بے عزتی کرتے۔

اگلی صبح سویرے ویلیری پہنچ گئی۔ وکٹر نے ایٹن واپسی کے لیے کپڑے اور کتابیں باندھیں۔ ویلیری نے پندرہ پونڈ دینے سے پہلے اسے نصیحتیں کیں۔ ''اپنا پرس کبھی ہپ پاکٹ میں نہیں رکھا کرو۔ تمہارے باپ کی خون پسینے کی کمائی کوئی بدمعاش لے گیا۔ خیر تمہیں سبق تو مل گیا۔ آئندہ بہت احتیاط سے کام لینا۔''

اس نے اپنا بیگ فرش پر رکھ دیا اور اسے الوداع کہنے بس سٹینڈ تک گئی۔ وکٹر نے اسے اپنے سکول سکارف کے بارے میں نہیں بتایا۔ ایٹن پہنچ کر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ سکول شاپ سے دوسرا سکارف خریدا تاکہ کوئی اس سے گمشدہ سکارف کے بارے میں نہ پوچھے۔''

پانچواں باب

وکٹر کے اگلے چھ سال یوں گزرے کہ وہ چھٹیاں البیئن میوز میں گزارتا۔ اس نے سکاٹ لینڈ، ویلز، لیک ڈسٹرکٹ، سٹریٹفورڈ آن ایون اور اپنی پسند کی ہر جگہ کی سیر کی۔ دارالعوام میں ہندوستان پر بحثوں کے دوران اس نے حصہ لیا۔ وہ اتوار کا دن سپیکرز کارنر میں تقریریں سنتے ہوئے گزارتا تھا۔ اس نے ہفتہ وار خطوط اور فون کالز کے ذریعے اپنے گھرانے سے رابطہ رکھا۔ چھ سال میں اس کا قد پانچ فٹ دو انچ سے پانچ فٹ گیارہ انچ ہو گیا۔ اب وہ ایک لڑکا نہیں بلکہ ایک دلکش جنٹل مین بن گیا تھا۔ تاہم اس کی آواز باریک ہی رہی۔ برسوں بعد جب کبھی کبھار آل انڈیا ریڈیو سے اس کی تقریریں نشر ہوئیں تو سامعین نے تبصرہ کیا کہ اس کی آواز گاندھی سے بہت زیادہ ملتی ہے۔

ویلیری انگلینڈ میں چھ ماہ کی تعطیلات گزار کر ہندوستان واپس چلی گئی۔ کسی کو یقینی علم نہیں تھا کہ وہ ہندوستان واپس کیوں گئی ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ مٹو کی بیٹیاں کالج پہنچ چکی تھیں اور انہیں اپنے ہوم ورک میں اس کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ گھر میں مٹو کا حکم چلتا تھا۔ وہ یورپی کھانے کھاتا جبکہ اس کی بیوی اپنے کمرے میں دال روٹی کھایا کرتی۔ مٹو نے ویلیری کو باغ میں ایک خواب گاہ والا کاٹیج دیا ہوا تھا۔ یہاں ان کی زندگی زیادہ پرسکون ہو گئی۔ وہ یہاں جنسی عمل سے

زیادہ لطف اندوز ہو سکتے تھے کیونکہ یہاں وہ اونچی آواز میں بول سکتے تھے۔ وہ شام کا وقت اپنے گھر والوں کے مقابلے میں اس کے ساتھ زیادہ گزارتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کے دوست ویلیری کو اس کی میم کہتے تھے۔ جو لوگ اس کے دوست نہیں تھے وہ ویلیری کو اس کی رکھیل کہتے تھے۔ مٹو نے اسے ہندوستان میں مکان لے کر دینے کی بجائے یقین دہانی کروائی کہ البین میوز والا فلیٹ اس کا ہو گا۔ جب وکٹر لندن آئے گا تو اسے استعمال کر لیا کرے گا۔

وکٹر نے ایٹن میں تعلیم کا سلسلہ مکمل ہو جانے کے بعد بیلیئل کالج آکسفورڈ میں داخلہ لے لیا۔ وہ آکسفورڈ یا کیمبرج میں اپنی پسند کے کسی بھی کالج میں داخلہ لے سکتا لیکن اس نے بیلیئل کا انتخاب صرف اس وجہ سے کیا تھا کہ اس میں دوسرے کالجوں کی نسبت زیادہ ہندوستانی طلباء تھے۔ وطن اور ہم وطنوں سے دوری نے انہیں وکٹر کے لیے بہت قیمتی بنا دیا تھا۔ وہ ان کے لیے وہ سب اچھی چیزیں چاہتا تھا' جو اس نے انگلینڈ میں دیکھی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ چیزیں وہ انہیں مہیا کرے۔ کالج کھلنے سے پہلے اس نے گرمیوں کی چھٹیاں دہلی میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ واپسی کے سفر کے لیے اس نے جنیوا سے بمبئی جانے والے اطالوی لائیڈ ٹریسٹینو جہاز ایم وی وکٹوریا کے ذریعے سفر کیا۔ اس کے علاوہ فرسٹ کلاس میں صرف ایک ہندوستانی راجہ اور اس کا گھرانہ سفر کر رہا تھا۔ نہ تو اس نے ان سے بات کی اور نہ وہ اس سے مخاطب ہوئے۔

بمبئی سے دہلی تک ٹرین کے سفر کے دوران وہ دیہاتی علاقوں کے اجڑے ہوئے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہا۔ ان لوگوں کو ان کے دیوتاؤں نے رد کر دیا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد دنیا کے تمام فطری ذرائع موجود تھے لیکن نوآبادیاتی غلبے نے انہیں ہر شے سے محروم کر رکھا تھا۔ اس کی تقدیر انہیں لوگوں میں تھی۔ انگریزوں نے

ہندوستان کو نہیں بدلنا تھا' اسے تو خود ہندوستانیوں نے بدلنا تھا۔ انہیں صرف صنعتی ترقی اور کسی مقصد کی ضرورت تھی۔ یہی اس کا مشن ہونا تھا۔

دہلی ریلوے سٹیشن پر اس کا باپ اس کی بہنیں' ویلیئر' رشتے دار اور دوست اس کے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سب نے اسے پہنانے کے لیے پھولوں کے ہار تھامے ہوئے تھے۔ جونہی وہ ٹرین سے اترا' اس کے باپ کے ملازم نعرے لگانے لگے: جے ہو چھوٹے صاحب کی جے ہو!

ایک پرانی پھولوں سے بجی اولڈز موبائل میں وہ اپنی بہنوں کے ساتھ بیٹھا' فرنٹ سیٹ پر اس کا باپ بیٹھا ہوا تھا۔ جب وہ گھر جا رہے تھے تو اس نے پوچھا:
''ماں کدھر ہے؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟''

''وہ گھر پر تمہارا انتظار کر رہی ہے'' اس کے باپ نے جواب دیا۔ ''وہ ٹھیک ہے لیکن وہ سٹیشن کے ہجوم میں نہیں آنا چاہتی تھی۔''

وکٹر کو یہ بات عجیب لگی۔ اس نے اپنی بہنوں کو دیکھا۔ انہوں نے کوئی بات نہیں کی' بس بے تاثر انداز میں اسے تکتی رہیں۔

جونہی کار پورٹیکو میں پہنچی وکٹر کی ماں باہر آئی۔ اس نے چاندی کی ایک تھالی تھامی ہوئی تھی جس میں سیندور بھرا ہوا تھا اور چراغ روشن تھے۔ اس نے تھالی اپنے بیٹے کے چہرے کے سامنے گھمائی' اس کی پیشانی پر سیندور کا نشان لگایا' تھالی ایک ملازم کو پکڑائی اور بیٹے کو بانہوں میں بھر لیا۔

''بیٹا تم نے واپس آنے اور اپنی ماں سے ملنے میں بہت وقت لگا دیا۔''

اتنا کہہ کر وہ اس سے چمٹ گئی اور رونے لگی۔

''ماں' کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟ کیا تم میری واپسی پر خوش نہیں ہو؟'' وکٹر نے پوچھا۔

وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے آنسو پونچھے اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''بے چاری جذبات سے مغلوب ہو گئی ہے'' اس کے باپ نے کہا ''وہ تمہاری واپسی کے دن گن رہی تھی۔''

وقت وکٹر کی توقع سے زیادہ تیزی سے گزر گیا۔ اس کے باپ نے انگریز ججوں اور سینئر افسروں اور امیر ہندوستانی دوستوں کو اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے بلایا۔ چند مرتبہ وہ اسے عدالتوں میں اپنے مقدمات کی کارروائی دکھانے لے گیا۔ وکٹر یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا کہ اگرچہ اس کا باپ ججوں کا بے حد احترام کرتا تھا' تاہم جج اس کے دلائل سے قائل ہوتے تھے۔ اس نے بے شمار جونیئر وکیلوں کو اس کے دفتر میں اپنے مقدمات کی تیاری کرتے دیکھا۔ ویلیری — جس کے حوالے سے وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کی بحیثیت گورنیس شانتی بھون میں مزید ٹھہرنے کی کوئی حقیقی وجہ نہیں رہی تھی — اس کے باپ کے دفتر کا انتظام سنبھال چکی تھی۔ وہ کلرکوں کی وقت پر دفتر آمد کو اور مٹو کے قانونی کاغذات کی درستی کو یقینی بناتی۔ شام کو وہ اس کی بہنوں کو انگریزی شاعری پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔

وکٹر کی بہنوں نے اسے اپنی سہیلیوں سے ملوایا۔ بعد میں وہ اس سے پوچھنے لگیں کہ اسے ان میں سے کون سی لڑکی سب سے اچھی لگی ہے۔ بہت ہنسی مذاق ہوا۔ وکٹر نے زیادہ سے زیادہ وقت اپنی ماں کے ساتھ گزارا۔ اس نے کبھی اپنی ماں کو خوش نہیں دیکھا تھا' لیکن اب اس کی اداسی ختم ہو گئی تھی۔ وہ جب بھی اس سے بات کرتی ہمیشہ اس کی صحت کے بارے میں فکرمندی کا اظہار کرتی۔ وہ اس سے پوچھتی کہ کیا وہ روزانہ دودھ پیتا ہے؟ وہ کیا کھاتا ہے؟ اس نے خصوصاً پوچھا کہ برہمن ہونے کی حیثیت سے وہ شراب سے تو دور رہا ہے نا۔ اسے سب سے زیادہ فکر

اس کی شادی کی رہتی تھی۔ ایک دن اس نے کہا: ''بیٹا! کبھی کسی گوری عورت سے شادی مت کرنا۔ وہ کبھی ہمارے گھرانے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے گی۔ ہندوستان کے چوٹی کے کشمیری گھرانوں نے اپنی بیٹیوں کے لیے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ وہ لڑکیاں انتہائی خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ جب تم تعلیم مکمل کر کے واپس آجاؤ تو انہیں میں سے کسی کو اپنی پسند کے مطابق چن لینا۔''

''ماں ابھی تو میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے جب میں واپس آؤں گا، تب تم میرے لیے کوئی لڑکی منتخب کر لینا، میں تمہاری پسند کو اپنا لوں گا۔'' وہ جب بھی اس موضوع پر بات کرتی، وہ انہیں الفاظ میں اسے یقین دہانی کروا دیتا تھا۔ وہ کم از کم اتنا تو کہہ سکتا تھا، اس کو جو کہ کبھی ایک باوقار خاتون ہوتی تھی اور جسے اب پرانے فرنیچر کی طرح کباڑ خانے کے کونے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کی بہنوں نے اس کے اس شبے کو یقین میں بدل دیا تھا کہ اب ویلیری گھر کی باقاعدہ مالکن بن چکی ہے۔ تاہم اس کے باوجود اس نے اپنے باپ یا ویلیری کے بارے میں برا نہیں سوچا۔

اسے پتا بھی نہیں چلا اور اس کے رخصت ہونے کا وقت آ گیا۔ اس نے گاندھی کو خط لکھ کر پوچھا کیا وہ آکسفورڈ واپسی سے پہلے اس سے مل سکتا ہے۔ گاندھی نے پوسٹ کارڈ کے ذریعے جواب دیا کہ وہ منگل کے سوا کسی بھی دن سابرمتی آ سکتا ہے۔ گاندھی منگل کے دن مون برت رکھتا تھا یعنی کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ وکٹر ٹرین کے ذریعے احمد آباد چلا گیا۔ اس مرتبہ صرف اس کے گھرانے کے افراد سٹیشن پر اسے الوداع کہنے آئے۔ وہ اگلی صبح احمد آباد پہنچ گیا۔ اس نے سابرمتی آشرم جانے کے لیے ایک کار کرائے پر لی۔

عجیب سی بات تھی کہ اسے گاندھی سے ویسی ہی قربت محسوس ہوتی تھی جیسے

اپنی ماں سے۔ گاندھی نے بھی ویسی ہی نصیحتیں کیں جیسی اس کی ماں نے کی تھیں۔

''مجھے امید ہے تم شراب نوشی نہیں کرتے ہو گے۔ یورپ میں تو ہر شخص شراب پیتا ہے۔''

''میں کبھی کبھار شراب پیتا ہوں' صرف تہواروں وغیرہ کے موقعے پر'' وکٹر نے جواب دیا۔

''اسے چھوؤ بھی نہیں' یہ زہر ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے' باپو۔ میں اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔''

''کیا تم ماس کھاتے ہو؟ یہ بھی بہت برا ہوتا ہے۔ یہ وحشیانہ عمل ہے۔''

''وہاں ہر کھانے میں شراب کی طرح ماس بھی پیش کیا جاتا ہے۔ بھلا میں کیا کر سکتا ہوں؟''

تم لندن میں سبزیوں کا بہت اچھا سالن حاصل کر سکتے ہو۔ جب میں وہاں تھا تو سبزیوں کے سالن ہی کھایا کرتا تھا۔ تمہیں جانوروں کا ماس نہیں کھانا چاہیے۔''

''میں کوشش کروں گا' لیکن وعدہ نہیں کر سکتا۔''

''اور عورتیں؟ مغربی دنیا ترغیبات سے بھری ہوئی ہے اور ان ملکوں میں پاپ کرنا بہت آسان ہے۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے کہ عورتوں سے دور رہو گے۔''

وکٹر چپ رہا۔ وہ باپو سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ خیر گزری کہ باپو نے موضوع بدل دیا۔ ''کیا تم اب بھی صنعتی ہندوستان پر یقین رکھتے ہو؟ سٹیل ملز' ٹیکسٹائل ملز اور اسی طرح کی دوسری سب چیزوں پر؟ کپڑا بننے والے لاکھوں جولاہوں کا کیا بنے گا؟''

''وہ ٹیکسٹائل ملوں میں ملازمت کر سکتے ہیں اور زیادہ رقم کما سکتے ہیں۔ ہم

اپنا کپڑا برآمد کر کے زرِ مبادلہ کما سکتے ہیں۔''

''کیا انہیں ان کی بستیوں سے نکال کر شہروں کی جھونپڑ پٹیوں میں لا پھینکا جائے؟ یہ تو درست نہیں ہے۔''

ایک گھنٹے تک ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر گاندھی کے سیکرٹری نے اسے بتایا کہ اسے دوسرے لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس نے اپنی جیبی گھڑی نکالی' وقت دیکھا اور بولا: ''وقت مقدس ہوتا ہے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔''

''ٹھیک ہے' باپو۔''

اس نے گاندھی کے پاؤں چھوئے اور رخصت چاہی۔ اسے بہت فخر محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ وہ گاندھی کے تصورات سے متفق نہیں تھا تاہم وہ اس میں ایک ایسی اجلی روح دیکھتا تھا جس کے لیے شخصی تقدیر ملک کی تقدیر سے مختلف نہیں ہوتی۔ اگرچہ وہ گاندھی کے طریقۂ کار سے تو متفق نہیں تھا تاہم وہ اس کے لوگوں کی فلاح — سیوا — کے نظریے سے متفق تھا اور اسے اپنی زندگی کا رہنما اصول بنانا چاہتا تھا۔

وکٹر احمد آباد سے ٹرین کے ذریعے بمبئی روانہ ہوا اور وہاں سے ایم وی' وکٹوریا کے ذریعے جنیوا روانہ ہو گیا۔ پھر وہ ٹرین کے ذریعے فرانس سے گزرا' فیری کے ذریعے انگلینڈ پہنچا اور آخر البیئن میوز میں اپنے فلیٹ میں پہنچ گیا۔ ویلیری نے ہفتے میں ایک مرتبہ فلیٹ اور فرنیچر کی صفائی کے لیے ایک جمعدار کو ملازم رکھا ہوا تھا۔ اسے فلیٹ بالکل صاف ستھرا ملا۔ یہ فلیٹ وکٹر کو دہلی والے شانتی بھون سے زیادہ اچھا لگتا تھا۔

ایٹن میں فائنل امتحان دینے کے فوری بعد وکٹر نے آکسفورڈ میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ بیلیئل کے ماسٹر سے ملا تھا' جس نے اسے داخلے کی یقین دہانی کروائی تھی۔ اس نے داخلہ فارم پر کیے اور قانون' فلسفے اور معاشیات کے مضامین کو

پڑھنے کے لیے منتخب کیا۔ اس نے گاندھی کی ہدایت کے مطابق انر ٹیمپل میں بھی داخلہ لے لیا۔ یوں وہ ہر سیشن کے بعد ٹیمپل میں ڈنر کرنے کے بعد البیئن میوز باقاعدگی سے جانے لگا۔

آکسفورڈ میں وکٹر کے روابط اپنے ہم عمر ہندوستانیوں سے استوار ہو گئے۔ وہاں مختلف کالجوں میں کوئی درجن بھر ہندوستانی پڑھتے تھے۔ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ''ہندوستانی مجلس'' میں ہر پندرھویں دن ملا کرتے تھے اور اپنے ملک کے حالات پر بحث مباحثہ کیا کرتے تھے۔ وہ کبھی کبھار قدامت پسندوں، سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو تقریر کرنے کے لیے مدعو کرتے تھے۔ وکٹر کو ان میٹنگوں کا انتظار رہتا تھا اور وہ وہاں جی بھر کر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا۔

وکٹر نے ہندوستانی لڑکوں کو دوست بنانے کی کوشش کی لیکن کسی کو بھی دوست بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ان میں سے تین لڑکے ہندوستانی راجاؤں کے بیٹے تھے۔ وہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔ ان کے ساتھ ملازموں کا ایک لشکر ہندوستان سے ان کی خدمت کے لیے آیا ہوا تھا۔ وہ تعلیم سے زیادہ کھیلوں اور انگریز لڑکیوں سے آشنائی (Dating) میں دلچسپی لیتے تھے۔ باقی ہندوستانی لڑکے متوسط طبقے کے خوشحال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے یا سینئر سول سرونٹس کے بیٹے تھے۔ ان کی واحد آرزو تھی انڈین سول سروس میں شامل ہونا یا اس میں ناکامی کی صورت میں ہندوستان میں انگریزوں کی ملکیتی کمپنیوں میں ملازمتوں کا حصول۔ یہ کمپنیاں بہت اچھی تنخواہیں دیتی تھیں۔ ان کی ترجیحات میں بھی انگریز لڑکیوں کو پھانسنا سرفہرست دکھائی دیتا تھا۔ انگلینڈ میں انہیں جس شے کے حصول کی سب سے زیادہ آرزو تھی، وہ ''میم کی ......'' تھی، باقی ہر شے کی اہمیت کم تھی۔ وکٹر کے پاس ان کے لیے بہت کم وقت ہوتا تھا اور وہ انہی چند لڑکیوں سے ملا کرتا تھا، جو ایلین سے

اس کے شناسا تھے۔

اس نے اپنی موسم گرما کی پہلی چھٹیاں البیمن میوز میں گزاریں۔ وہ دن کا زیادہ حصہ پڑھنے میں گزارتا اور سہ پہر کے وقت ہائیڈ پارک میں دیر تک پیدل سیر کرتا۔ جو امر اسے سب سے زیادہ دق کرتا تھا' وہ دن کی روشنی میں ایک دوسرے کو خوب زور سے جپھی ڈالے لیٹے ہوئے جوڑوں کا نظارہ تھا۔ وہ حیرت سے سوچتا کہ ان کے پاس ایسی جگہیں نہیں ہیں جہاں وہ محبت کا عمل تخلیئے میں انجام دے سکیں؟ وہ بے راہرو تو نہیں تھا' لیکن یہ مناظر اس کے ذہن پر چھائے رہتے اور نیند میں اسے ستاتے تھے۔ وہ ایک گرم گرم جسم کی آرزو میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا۔

چھٹیوں کے دوران اس نے مانچسٹر جا کر جدید ٹیکسٹائل ملوں کا مشاہدہ کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ گاندھی ان کی پیداوار سے اس قدر متنفر کیوں ہے۔ ان مشاہدات کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ مانچسٹر کی پیداوار کو مارکیٹ سے نکالنے کے لیے ہندوستان میں اعلیٰ درجے کا کپڑا سستے داموں تیار کرنا ہو گا اور کپڑا بننے کے ازمنۂ وسطیٰ کے طریقوں سے چھٹکارا پانا ہو گا۔ ہندوستان میں محنت مغربی دنیا سے دس گنا سستی تھی۔ ضرورت صرف جدید ترین مشینوں اور ٹیکنالوجی کی تھی۔ اس نے اس حوالے سے اپنے باپ اور گاندھی کو خط لکھے۔ اس نے شیفیلڈ جا کر لوہے کے کارخانوں کا بھی مشاہدہ کیا۔

ہندوستان میں خام لوہا اور کوئلہ بڑی مقدار میں موجود تھا۔ اسے اپنی ضرورت کی پیداوار کے لیے حاجت صرف اور صرف جدید مشینری اور ماہرین کی تھی۔ ہندوستان قلم تراش چاقو سے لے کر شیونگ بلیڈ اور ریلوے سے لے کر پلوں تک کے لیے لوہے کو استعمال کر سکتا تھا نیز اسے برآمد کرنے کے لیے بھی لوہا وافر دستیاب ہوتا۔ اس نے اس حوالے سے بھی اپنے باپ اور گاندھی کو خط لکھے۔

آکسفورڈ واپس آ کر اس نے ہندوستانی مجلس کے ایک اجلاس میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سب لڑکوں نے خاموشی سے اس کی تقریر سنی اور کوئی بات نہیں کی۔

ایک سال بعد وکٹر کو ایک ایسا ہندوستانی لڑکا ملا' جو سنجیدہ موضوعات پر بات کر سکتا تھا۔ وہ بیلیئل میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ اسے ہندوستان سے کسی قسم کا وظیفہ ملا تھا' جس سے انز آف کورٹ میں اس کی فیس اور داخلہ ہی بمشکل ہو سکا۔ وہ ایک دبلا پتلا' سیاہ رنگت والا لڑکا تھا۔ اس کی آنکھیں چمکدار اور گہرے سیاہ رنگ کے بال گھنگھریالے تھے۔اس کی ناک مڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر وکٹر کو شیکسپیئر کا کیسیئس یاد آ گیا' دبلا پتلا اور بھوکا دکھائی دینے والا ایک شخص۔ ڈرامے کے کردار کیسیئس کی طرح یہ لڑکا بھی ہر وقت سوچ میں ڈوبا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا نام مدھون نائر تھا۔ اس کا تعلق کیرالہ سے تھا۔ مستقبل میں اسے وکٹر کی زندگی میں ایک اہم شخص بن جانا تھا۔

نائر بے تحاشا چائے پیا کرتا تھا۔ وہ کھانے میں نمکین بسکٹ اور ٹماٹروں کا شوربہ لیا کرتا تھا۔ وہ ہر وقت ایک پرانا سا اوورکوٹ پہنے رہتا تھا لیکن سردی ہو یا گرمی کپکپاتا رہتا تھا۔ اس کے بارے میں افواہ تھی کہ وہ کمیونسٹ ہے۔ وکٹر کی اس سے پہلی ملاقات مجلس میں ہوئی تھی۔ اس اجلاس میں انہوں نے ہندوستان کے مستقبل میں ہندوستانی راجاؤں کے کردار پر بحث کی تھی۔ راجاؤں کے بیٹوں نے کہا کہ انہیں بہت بڑی بڑی ریاستوں کے انتظام کا تجربہ ہے' جن میں سے کچھ تو انگریزوں کے زیرانتظام صوبوں سے بھی بڑی ہیں' لہٰذا وہ ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ نائر اپنی نشست سے اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنے ملیالی لہجے میں بولا: ''تم راجے کوڑے دان میں پڑے ہو گے! تم غریبوں کے خون پر پلنے والی جونکیں ہو' تم دھرتی کا بوجھ ہو! تمہیں جتنی جلدی مٹا دیا جائے ہندوستان کے لیے اتنا ہی بہتر ہے۔''

وہاں شور برپا ہو گیا۔ چند لڑکوں نے مطالبہ کیا کہ وہ معافی مانگے' دوسرے مسکرانے لگے۔ نائر ان کے درمیان نہایت جرأت کے ساتھ سر تانے کھڑا رہا۔ وکٹر اس کی جرأت مندی سے بہت متاثر ہوا۔ میٹنگ کے بعد وہ نائر کے پاس گیا۔ اس نے نائر کے پنجہ نما ہاتھ سے ہاتھ ملایا۔ ''میں جے بھگوان ہوں۔ میں دہلی سے آیا ہوا ہوں۔ میں تمہاری ہر بات سے متفق ہوں۔'' یوں وہ دوست بن گئے۔

نائر کمیونسٹ پارٹی کا نہیں بلکہ انڈین نیشنل کانگرس (گاندھی) کا باقاعدہ رکن تھا۔ اس نے لندن میں لیبر پارٹی کے بائیں بازو کے سوشلسٹ گروپ کی رکنیت حاصل کر لی تھی۔ وہ ہندوستان سے اپنے سرپرستوں کے تعارفی خطوں کے ساتھ آیا تھا اور اس نے کچھ انگریز انقلابیوں کے ساتھ مل کر دی فری انڈیا سوسائٹی بنا لی تھی۔ اس سوسائٹی کے دو درجن کے قریب اراکین تھے' جن میں سے زیادہ تر ایسے مرد اور خواتین تھیں' جو کہ انگریز معاشرے کے بالائی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ نائر کو اپنے گھروں میں لے گئے۔ اس کی وضع قطع ایسی تھی کہ ان انگریز انقلابیوں کو اس کے ذریعے اپنے آپ کو بائیں بازو والا ظاہر کرنے کا موقع مل گیا۔ چند انگریز لڑکیاں تو اس کی فاقہ زدہ حالت دیکھ کر اس سے مادرانہ شفقت کا اظہار کرنے لگیں۔ اسے ان لڑکیوں کو اپنے بستر کی زینت بنانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

نائر وکٹر سے بالکل مختلف تھا لیکن انہوں نے اس فرق کو شروع ہی سے توجہ نہیں دی۔ وکٹر اس کی ذہانت اور مباحثوں کے دوران مخالفوں کو منہ توڑ جواب دینے کی صلاحیت سے متاثر تھا۔ اس کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا اور وہ اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کر سکتا تھا کہ انگریزوں نے ہندوستان کا کتنا استحصال کیا ہے۔ دوسری طرف نائر اپنے حوالے سے وکٹر کی رائے سے بہت خوش تھا اور اپنے آپ کو اس امیر ہندوستانی نوجوان کا دانشور اتالیق تصور کرتا تھا۔ اگرچہ وکٹر کو سیاست سے زیادہ

دلچسپی نہیں تھی' تاہم وہ نائر کی فری انڈیا سوسائٹی میں شامل ہو گیا۔

وہ کالج کے بعد کا بیشتر وقت ساتھ گزارنے لگے۔ وکٹر اکثر و بیشتر اسے رات کے کھانے کے لیے باہر مدعو کرنے لگا۔ وہ زیادہ نہیں کھایا کرتا تھا۔ اس کا کھانا ٹماٹروں کے شوربے اور ٹوسٹ پر مشتمل ہوتا تھا جس کے ساتھ وہ چائے کے کئی کئی پیالے پی جاتا تھا۔ وہ نہ گوشت کھاتا تھا نہ بیئر اور وائن پیتا تھا۔ ایک شام وکٹر نے اسے کہا: ''پتا ہے' تم اک ذرا سادھو ہو۔ میری سمجھ سے باہر ہے کہ تم اس سرد مرطوب آب و ہوا میں کس طرح زندہ ہو۔''

نائر ہنسنے لگا ''جسم کو اس کچرے کی ضرورت نہیں ہوتی جو تم لوگ صبح' دوپہر اور شام کو اپنے اندر پھینکتے ہو۔ سب کچھ بدبودار فضلہ بن کر نکل جاتا ہے۔''

وہ مسلسل باتیں کرتے رہتے تھے۔ نائر انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال پھینکنے کی ضرورت کے حوالے سے باتیں کرتا اور وکٹر ہندوستان کو امیر اور خوشحال بنانے کے طریقوں کے بارے میں۔

''تم اپنے خیالات کو قلمبند کیوں کرتے؟ میں تمہاری مدد کروں گا۔ دوسرے لوگوں کو ہندوستان کے حوالے سے اپنے خوابوں سے آگاہ کرو' نائر نے ایک اور شام کو وکٹر سے کہا تھا۔

''میں اور کچھ لکھوں؟ میرا مذاق مت اڑاؤ'' وکٹر نے کہا۔ ''اگر میری زندگی کا دارومدار بھی لکھنے پر ہو تو میں نہیں لکھ سکتا۔ میں صرف اپنے والدین کو خط لکھتا ہوں۔ میں نے تو کبھی محبت نامہ بھی نہیں لکھا ہے۔''

''تم کسی بھی وقت لکھنا شروع کر سکتے ہوں۔ ہندوستان کو اپنی محبوبہ تصور کرتے ہوئے کئی ابواب پر مشتمل ایک طویل محبت نامہ لکھو۔''

''میری بکواسیات کو کون پڑھے گا؟ یہ تو وقت کا ضیاع ہو گا۔ اس کے علاوہ

مجھے اپنے امتحانات کی تیاری کرنا ہے۔ آکسفورڈ اور بار کے آخری امتحانات ہونے والے ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے؟"

"وقت نکالو۔ اپنی شامیں مسلسل بیکار کاموں میں ضائع کرنے کی بجائے روزانہ ایک صفحہ لکھو اور جو کچھ تمہارے اندر نہاں ہے' اسے عیاں کرو۔"

"اسے کون شائع کرے گا؟"

"یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم کتاب لکھو' میں اسے شائع کرواؤں گا۔ ہم فری انڈیا سوسائٹی کی طرف سے اسے شائع کریں گے۔"

یہ خیال وکٹر کے ذہن پر چھا گیا۔ اپنے نام سے کتاب شائع ہونا اس کے لیے انتہائی خوشگوار امر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی کتاب ساری دنیا میں کتابوں کی دکانوں میں سجی ہوئی کیسی لگے گی۔ لوگ کتاب خرید کر اس کے آٹوگراف لینے آیا کریں گے۔ یہ تصور بڑا ولولہ انگیز تھا۔ وکٹر نے "انڈیا آف مائی ڈریمز" کے عنوان سے کتاب لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

وکٹر اپنے امتحانات کی تیاری بڑی محنت سے کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کتاب کے لیے نوٹس بھی لکھتا جا رہا تھا۔ وہ ہر باب کا خاکہ تیار کرنے سے پہلے اس کے بارے میں نائر کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتا۔ پھر اس باب کا خاکہ لکھنے کے بعد نائر کو دکھاتا۔ جونہی امتحان ختم ہوئے' وہ البیئن میوز جا کر کتاب لکھنے بیٹھ گیا۔ کتاب ایک ماہ میں مکمل ہو گئی۔ کتاب مکمل کرنے کے بعد اس نے لندن میں انز آف کورٹ جا کر مسودہ نائر کے حوالے کر دیا۔ ایک ماہ بعد اسے لیفٹ بک پبلشرز کی طرف سے ایک کنٹریکٹ فارم موصول ہوا۔ وکٹر تو ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنے باپ کو ایک لمبا ٹیلیگرام بھیجا۔ جواب میں اس کے باپ نے مبارکباد کا ٹیلیگرام بھیجا۔ وہ اس کا پہلا خریدار بھی تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ اسے

کتاب کی 500 جلدیں بحری جہاز کے ذریعے ہندوستان بھیج دے۔ وہ انہیں اپنے دوستوں میں بانٹنا چاہتا تھا۔ وہ کتاب کا ایک آٹوگراف والا نسخہ سابرمتی میں گاندھی کو بھی بھیجنا چاہتا تھا۔

وکٹر کو امید تھی کہ وہ فرسٹ ڈویژن حاصل کرے گا لیکن اسے صرف سیکنڈ ڈویژن ملی۔ وہ اس ناکامی پر بہت زیادہ پریشان نہیں ہوا۔ آکسفورڈ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ بار کے امتحانات دینے سے بچ گیا۔ اس نے اپنا بیرسٹر کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ اس نے اپنے وزٹنگ کارڈز پر درج ذیل عبارت چھپوائی: وی۔جے۔بھگوان بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ دو سو کارڈوں پر اس کا البیئن میوز والا پتا تھا اور باقی دو سو پر اس کے باپ کا۔

یورپ کی مزید سیر کرنے کی اپنے باپ کی تجویز پر عمل کرنے کی بجائے وکٹر نے لندن ہی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے اس شہر سے بڑا لگاؤ ہو گیا تھا۔ اسے وسطی لندن میں گھومنا' ٹرافالگر سکوائر میں کبوتروں کو دانہ ڈالتے ہوئے لوگوں کو دیکھنا' شام کے وقت ہزاروں سٹارلنگ پرندوں کی چہچہاہٹ سننا' دکانوں کی کھڑکیوں میں بجی اشیا اور تیزی سے گزرتے ہجوم کو تکنا بہت پسند تھا۔ اسے ہائیڈ پارک کا سپیکرز کارنر بھی بے حد پسند تھا۔ اسے اپنے چھوٹے فلیٹ کی گھٹی گھٹی سی فضا سے نکل کر بیس واٹر روڈ پر ٹہلنا بہت اچھا لگتا تھا۔ تاہم اس نے مانچسٹر میں مزید کچھ دن گزارے۔ وہ انگلینڈ کی سب سے بڑی ٹیکسٹائل مل کے جنرل مینیجر سے ملا۔ اس نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے ہندوستان میں ایک جدید ٹیکسٹائل مل لگانے میں شراکت سے دلچسپی ہے۔ جنرل مینیجر نے کہا: ''مجھے اپنے بورڈ آف ڈائریکٹرز سے مشورہ کرنا ہو گا میں تمہیں تین دن بعد جواب دوں گا۔''

جواب وکٹر کی توقع کے مطابق نفی میں ملا۔ وہ ہندوستان میں ٹیکسٹائل مل لگا

کر خود اپنے پیروں پر کلہاڑا کیسے مار سکتے تھے؟ وکٹر نے حوصلہ نہ ہارا۔ اس نے ٹیکسٹائل مشینری تیار کرنے والوں سے رابطہ کیا۔ وہ معقول قیمتوں پر جدید ترین مشین بیچنے پر بخوشی تیار ہو گئے۔ اس نے ملوں کے نقشے تیار کرنے والے آرکیٹکٹوں اور مشینوں کی تنصیب کرنے والے ٹیکنیشنوں سے بھی رابطے کیے۔ وہ پرکشش معاوضوں پر تین ماہ کے لیے ہندوستان جا کر کام کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وکٹر نے ان کے نام اور پتے لکھ لیے اور ان سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی انہیں باقاعدہ کنٹریکٹ بھیجے گا۔ اس نے بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں اپنے اور ہندوستان کے مستقبل کی صورت گری کے پروجیکٹ کا آغاز کر دیا تھا۔

چھٹا باب

وکٹر نے اپنے کچھ کپڑے اور دوسرا سامان لندن والے فلیٹ میں چھوڑا تاکہ ویلیری سمجھ جائے کہ وہ جب بھی چاہے گا' وہاں رہنے کے لیے آ جائے گا۔ اس کے بعد وہ دہلی واپس چلا گیا۔ وہ ہر کسی کے لیے تحفوں سے لدا پھندا شانتی بھون پہنچا۔ وہ اپنے باپ کے لیے ایک سونے کا فاؤنٹین پین' اپنی ماں کے لیے انگورا بکری کی اون کی شال' اپنی بہنوں کے لیے سکارف اور پرفیومز کی شیشیاں اور ویلیری کے لیے ایک باتصویر بائبل لایا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق اس کے باپ کے کئی دوست اس کی کتاب پر اس کے آٹوگراف لینے آئے۔ اس نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ کیا انہوں نے کتاب پڑھی ہے۔ اس کی گھر واپسی کی خوشی منانے کے بعد ایک روز ناشتے کی میز پر اس کے باپ نے پوچھا: اچھا تو جے اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

اس نے کسی توقف کے بغیر کہا: ''میں دہلی' بمبئی یا احمد آباد میں ہندوستان کی سب سے بڑی اور جدید ترین ٹیکسٹائل فیکٹری لگانا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں زمین اور انگلینڈ سے مشینری خریدنے کے لیے رقم کی ضرورت ہو گی۔ میں اپنی ضرورتیں تفصیل کے ساتھ لکھ لایا ہوں۔''

متھو جواب دینے سے پہلے کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا: ''میں نے اتنی رقم تو جمع نہیں کی ہوئی۔ ہمیں ایک پبلک کمپنی بنا کر لوگوں کے حصص بیچنے پڑیں گے۔ مجھے یقین

ہے کہ میرے کچھ امیر مؤکل حصص خرید لیں گے۔ تاہم ہمیں کمپنی کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں رکھنا ہوگا۔ تم موزوں جگہ تلاش کرو۔ کسی اور شہر کی بجائے دہلی کے نزدیک جگہ حاصل کرنا آسان رہے گا۔ میں تمہیں لینڈ ایجنٹس سے ملوا دوں گا' جو تمہیں دستیاب جگہیں دکھالائیں گے۔"

اس کے بعد کے دن شدید مصروفیت میں گزرے۔ وکٹر دن کا بیشتر حصہ گھر سے باہر رہتا۔ اسے کم از کم 15 ایکڑ زمین درکار تھی' جو کہ غیر متنازعہ ہو اور جس کا قبضہ فوری طور پر مل جائے۔ یہ 1930ء کی دہائی کے وسط کی بات ہے اور اس زمانے میں اچھی زمین کی قلت ہو چکی تھی۔ آخر اسے دریائے جمنا سے دس میل دور ایک بستی کے قریب مطلوبہ زمین مل گئی۔ وہ زمین شور زدہ تھی۔ اس نے بستی والوں کی پنچایت بلائی اور ان سے پوچھا کہ انہیں اپنی بستی کے قریب ایک کارخانہ لگانے پر اعتراض تو نہیں ہوگا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اسے اپنے پروجیکٹ کو کامیابی سے ہمکنار کرنا ہے تو اسے ان لوگوں کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔"میں تمہیں اس بنجر زمین کی منہ مانگی قیمت دوں گا۔ میں تمہارے لڑکوں اور لڑکیوں کو نوکریاں بھی دوں گا۔"

وہ لوگ بہت خوش ہوئے "آپ کو جو قیمت مناسب لگے' دے دیجیے۔ آپ کی آمد ہماری بستی میں اجالا پھیلا دے گی۔ ہماری آنے والی نسلیں بھی آپ کو دعائیں دیں گی۔"

"کپاس اگاؤ' اعلیٰ معیار کی کپاس۔" اس نے انہیں کہا۔"تم جو اگاؤ گے میں خرید لوں گا۔"

اس نے ان کے ساتھ خیر سگالی کے اظہار کے لیے حقہ پیا۔ بوڑھی عورتوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر اسے دعا دی۔ نوجوان عورتیں اپنے آدھے کھنچے ہوئے نقابوں کی اوٹ سے اسے تکتی رہیں۔ چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں اردگرد کھڑے اسے

تک رہے تھے اور دانت نکال رہے تھے۔ اس روز وکٹر بہت خوش تھا۔ اس نے پہلی رکاوٹ پار کر لی تھی۔

اس نے یہ خوشخبری اپنے گھر والوں کو سنائی۔ اس دوران اس کے باپ نے کمپنی کے قیام کی دستاویزات تیار کر لیں۔ وہ اس کا تاحیات چیئرمین تھا اور وکٹر جنرل مینیجر۔ اس کی ماں اور بہنیں حصہ دار تھیں۔ باقی حصص عوام کو فروخت کیے جانے تھے۔ کمپنی کا نام جے بھگوان ٹیکسٹائلز رکھا گیا تھا۔

اگلے دن وکٹر نے آرکیٹیکٹ اور تحصیلدار کے ساتھ جا کر زمین پر مختلف حصوں میں نشانات لگوائے۔ وکٹر نے آرکیٹیکٹ سے کہا کہ اسے صرف ورکروں کے کوارٹروں کو ڈیزائن کرنا ہے۔ ہر کوارٹر میں تین کمرے، ایک چھوٹا صحن، لیٹرین اور غسل خانہ بنایا جانا تھا۔ باقی نقشہ انگلینڈ سے آنے والے آرکیٹیکٹ نے بنانا تھا۔ اس نے نائر کو خط لکھ کر اسے لندن میں کمپنی کا ایجنٹ بننے کی دعوت دی اور ایک پرکشش تنخواہ کی پیشکش کی۔ اس نے اس کے لیے سفری اخراجات، اور حصص کی فروخت پر کمیشن کی بھی پیشکش کی تھی۔ اسے آرکیٹیکٹ اور مکینکوں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ نائر بہت پرجوش ہو گیا۔ اس نے پہلے کبھی اتنا پیسہ نہیں دیکھا تھا۔ اتنی رقم ملنے کے بعد وہ آکسفورڈ سے تعلیم مکمل کر کے لندن ہی میں آباد ہو سکتا تھا۔ قانون کے پیشے سے اس کے روزی کمانے کا امکان زیادہ روشن نہیں تھا۔

وکٹر پر تو گویا جنون سوار ہو چکا تھا۔ انگریز آرکیٹیکٹ، ٹیکنیشنوں اور سپننگ اور ویونگ مشینوں کے کریٹ ہندوستان پہنچنے سے پہلے ہی اس نے ملک کے مختلف شہروں میں جدید ترین ٹیکسٹائل ملیں لگانے کی منصوبہ سازی شروع کر دی۔ اس نے موجودہ ملوں میں کام کرنے والے محنت کشوں کو بہت زیادہ تنخواہوں پر ملازمتوں کی

پیشکشیں دینے کا بھی آغاز کر دیا۔

ایک ماہ بعد آرکیٹیکٹ ہندوستان پہنچ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ان ملوں کے ڈیزائن لایا تھا، جنہیں مانچسٹر میں لگایا گیا تھا۔ دو ماہ بعد مشینیں بھی پہنچ گئیں۔ وکٹر اپنی ماں کو خوشی مہیا کرنے کے لیے اسے بھومی پوجا کے واسطے لے گیا اور اس سے مل کی بنیاد رکھوائی۔ جے بھگوان ٹیکسٹائلز ٹھوس روپ اختیار کرنے لگی تھی۔ چھ ماہ بعد مل کام کے لیے تیار ہو گئی۔ مٹو نے مل کے افتتاح کی تقریب میں وائسرائے کو مدعو کیا۔ اس نے مہاتما گاندھی کو اس تقریب میں نہیں بلایا۔ افتتاحی تقریب میں شہر کے طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے شرکت کی۔ ان میں کپڑے کے چھوٹے اور بڑے تاجر بھی شریک تھے۔ وائسرائے نے مشینوں کو چلانے کے لیے بٹن دبا کر مل کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد مہمانوں کو ٹیکسٹائل مل کی سیر کروائی گئی۔ پھر چائے، سینڈوچز اور کیکوں سے ان کی تواضع کی گئی۔ رخصت ہوتے وقت انہیں مل میں تیار ہونے والی اشیا تحفتاً پیش کی گئیں۔ ان اشیاء میں بستروں کی چادریں، میز پوش، ساڑھیاں، پردے، فرنیچروں کو ڈھانپنے والے کپڑے، تولیے اور نیپکن شامل تھے۔ ہندوستان کی کسی دوسری ٹیکسٹائل مل میں بیک وقت اتنی بہت سی اشیا تیار نہیں کی جاتی تھیں۔ وکٹر چھوٹا موٹا کام کرنے پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ جے بھگوان ٹیکسٹائلز ملک کی سب سے بڑی مل تھی۔

وکٹر نے مہاتما کو اپنی مل میں تیار ہونے والی اشیا کا پارسل بھیجا۔ اس نے اسے ایک خط بھی لکھا جس میں اس سے دعا کی گزارش کی اور بھیجی جانے والی اشیا کو اپنی سوچ کے مطابق موزوں انداز میں استعمال کرنے کا کہا۔ چند دن بعد اسے ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا، جس پر صرف دو لفظوں میں جواب دیا گیا تھا: ''جیتے رہو۔''

پیسہ آنے لگا۔ حصہ داروں کو منافعوں کی ادائیگی کے بعد وکٹر نے اپنے

منافعے کی رقم سے مزید ٹیکسٹائل ملیں لگانا شروع کر دیں۔ اس کا منصوبہ ہندوستان کی ہر ریاست میں ایک مل لگانے کا تھا۔ بہت سی پرانی ملیں فروخت ہو رہی تھیں۔ اس نے انہیں خرید کر بہتر بنوا لیا۔ اس نے ہندوستانی صنعت کاروں کو نعرہ دیا: ''جدید بنو یا مٹ جاؤ۔'' دو برسوں ہی میں یہ کیفیت ہو گئی کہ ملک میں اس قدر برطانوی کپڑا نہ رہا کہ مہاتما اور اس کے پیروکار احتجاج کریں۔ ہندوستان کے بازاروں میں ہندوستانی کپڑا عام ملنے لگا نیز کچھ غیر ممالک کو برآمد بھی کیا جانے لگا۔

جب وکٹر کی چند ابتدائی ٹیکسٹائل ملیں تیاری کے مرحلوں سے گزر رہی تھیں' تب اس نے شوگر ملیں لگانے کا بھی فیصلہ کر لیا تھا۔ انگریز چقندر سے چینی بناتے تھے۔ اس نے گنے سے چینی بنانے کے لیے دوسرے ملکوں سے مشینری درآمد کی۔ اس نے گنا پیدا کرنے والی ریاستوں میں جے بھگوان شوگر ملز لگانی شروع کر دیں۔

بمشکل پانچ سال کے عرصے میں وکٹر نے ملک کے ایک چوتھائی حصے میں ملیں لگا دیں۔ اس کی بڑی بڑی فیکٹریوں کے اردگرد چھوٹے چھوٹے قصبے آباد ہونے لگے۔ وہ اپنے ورکروں کو بہت اونچی تنخواہیں دیا کرتا تھا۔ اس نے ان کے لیے ہاؤسنگ کالونیاں تعمیر کروائیں۔ اس نے اپنی تمام اشیا کی قیمتیں کم رکھیں۔ پیسہ اچھی شے ہوتا ہے لیکن اس نے پیسے کے لیے ملیں نہیں لگائی تھیں' اس کا حقیقی عزم تو ہر ہندوستانی کو خوشحال بنا دینا تھا۔ ایک دن اس کی ایک بہن نے اسے کہا کہ اس کا مقصد بہت بلند ہے اور وہ بہت ہی زیادہ محنت کر رہا ہے جبکہ ابھی وہ صرف تیس برس کا ہوا ہے۔ اس نے کہا: ''میں ایک آتش فشاں ہوں' مجھ میں بے انتہا توانائی ہے کیونکہ اس ملک میں ابھی بہت کام ہونے ہیں۔ میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا۔''

اگلے دو برسوں میں وکٹر نے کیمیکلز' سیمنٹ اور سائیکلیں تیار کرنے کے کارخانے لگائے۔ آخر وہ بحری جہازرانی کے پیشے میں داخل ہو گیا۔ اسی وجہ سے

ضروری ہو گیا کہ وہ اپنا کاروباری مرکز بمبئی کو بنائے۔ اس نے میرین ڈرائیو پر کچھ پرانی عمارتیں خرید کر ان کی جگہ ایک تیس منزلہ عمارت تعمیر کروائی۔ اس عمارت کا نام جے بھگوان ٹاورز رکھا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کی ہندوستان کی پہلی عمارت تھی۔ اس نے پینٹ ہاؤس اور اس سے نچلی منزل کو اپنی رہائش کے لیے مخصوص کر لیا۔ باقی منزلوں پر اس کی کاروباری سلطنت کے دفاتر قائم کیے گئے۔

اس تمام عرصے میں وکٹر آزادی کی جدوجہد سے دور رہا۔ وہ ''راج'' کا حامی تو نہیں تھا لیکن اسے سیاست کا بھی شوق نہیں تھا۔ نائر جیسے لوگ سیاست کو بہتر سمجھتے تھے۔ وہ نوآبادیاتی نظام کے نظریہ سازوں کو دنداں شکن جواب دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ باپو گاندھی اور اس کے پیروکار تھے' جو انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لیے سرگرم تھے۔ وکٹر کے نزدیک ہندوستان میں صنعتیں لگانا' اسے معاشی طور پر مضبوط بنانا زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے بغیر آزادی کی کوئی افادیت نہ ہوتی۔ ملک کو جدید بنانے کے لیے بہت کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ ہر گھر کو روشن کرنے اور مشینیں چلانے کے لیے بجلی پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ دور افتادہ بستیوں کو شہروں اور قصبوں سے ملانے کے لیے ہائی وے تعمیر کرنا اور ریلوے لائنیں بچھانا ضروری تھا' زرعی پیداوار میں اضافے کے لیے کیمیائی کھادیں اور کیڑے مار ادویات تیار کرنا تھا نیز گاڑیاں' بحری جہاز اور ہوائی جہاز بھی خود تیار کرنے تھے۔ یہ میدان لامحدود تھا۔ پہلا قدم اٹھانا حکومت کی ذمہ داری تھی۔ اگرچہ انگریز بھی ایسا کرنا اپنے لیے فائدہ مند سمجھتے تھے لیکن وہ فاشسٹ طاقتوں کے خلاف زندگی موت کی کشمکش میں پھنسے ہوئے تھے اور اس جنگ کو جیتنے کے علاوہ کچھ اور سوچنا غداری تصور کرتے تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہوا تھا کہ جنگ ختم ہوتے ہی اقتدار ہندوستانیوں کے حوالے کر دیں گے۔ گاندھی سمیت کچھ ہندوستانیوں کو بھروسہ تھا کہ

وہ اپنے وعدے کو پورا کریں گے۔ وکٹر بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔ تاہم وہ نہیں چاہتا تھا کہ آزاد ہندوستان پسماندہ اور غریب ہو۔

جنگ کے دوران اس کے تمام کاروباری اداروں نے زبردست منافع کمایا۔ کانگرس کے رہنما گاندھی کے وسیلے سے اس سے فنڈز کے لیے رابطہ کرتے اور وہ ہمیشہ انہیں فنڈز مہیا کر دیتا۔ وائسرائے نے اسے اپنی کونسل میں شرکت کی پیشکش بھیجی لیکن اس نے مہذب انداز میں انکار کر دیا۔ وہ باپو گاندھی اور دوسرے قومی رہنماؤں کو جیل میں ڈالنے والی حکومت کا حصہ نہیں بن سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر آزاد ہندوستان کے حکمران کسی بھی حیثیت میں اس کا مشورہ چاہیں گے تو وہ ان کی پیشکش پر ہمدردانہ غور کرے گا۔

ساتواں باب

وکٹر نے اپنی ماں کے علاوہ باقی سب افرادِ خانہ کو کاروباری مصروفیات میں شامل کر لیا تھا' جس کی وجہ سے ان کے پاس شخصی معاملات کو سلجھانے کے لیے تھوڑا وقت بچا تھا۔ مٹو وکٹر کی بہت سے کمپنیوں کے صدر کی حیثیت سے اپنی وکالت کی آمدنی سے کئی گنا زیادہ کما رہا تھا۔ (اس نے اب بھی ویلیری بوٹوملی کو اپنی پرسنل سیکرٹری بنا رکھا تھا۔ اس نے بھی انگلینڈ واپس جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا)۔ ان کا خاندان ہندوستان کا امیر ترین خاندان بن چکا تھا' تاہم وکٹر کی ماں کے لیے اس امر کی اہمیت بہت کم تھی۔ ''تم سب مایا جال میں پھنس چکے ہو' ایک دن اس نے ویلیری کی غیر موجودگی میں کہا: ''جے بھگوان! کیا تم نے کبھی اپنی تین بہنوں کی شادی کے بارے میں سوچا ہے؟ کیا تم نے کبھی اپنی شادی کے بارے میں سوچا ہے؟''

اس کی بات کا جواب اس کے خاوند نے دیا: ''کئی امیر گھرانوں اور راجاؤں نے اس سلسلے میں مجھ سے رابطہ کیا تھا' لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میرا پختہ ارادہ ہے کہ میں اپنی کسی بیٹی کی شادی کسی راجا کے بیٹے سے نہیں کروں گا۔ میں ان میں سے بہت سوں کو جانتا ہوں۔ وہ عیاش اور شراب کے رسیا ہیں۔ ان کی کوئی گھریلو زندگی نہیں ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ ہم برہمن ہیں اور آپ راجپوت' ہمارے درمیان رشتہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے دھرم کی رو سے ایسا ممنوع ہے۔''

وہ سب دل کھول کر ہنسنے لگے۔ مٹو کی بیوی اسے ایک گھریلو مرد نہیں سمجھتی تھی' اس لیے وہ ان کی ہنسی میں شریک نہیں ہوئی۔

''دوسروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں میری بیٹیوں کے لیے کوئی اچھا بر نہیں ملا؟''

''میں چاہتا ہوں کہ وہ خود انتخاب کریں'' مٹو نے جواب دیا۔ ''میں لڑکوں کو باری باری بلاؤں گا اور انتخاب لڑکیوں پر چھوڑ دوں گا۔''

پس ایسا ہی ہوا۔ مٹو کی ہر بیٹی کی عمر ہندوستانی معیارات کے اعتبار سے شادی کی عمر سے زیادہ ہو گئی تھی' تاہم انہیں سونے کے زیورات اور قیمتی ملبوسات کے علاوہ جہیز میں جے بھگوان کی کمپنیوں کے حصص بھی ملنے تھے۔ سب سے بڑی لڑکی نے ایک سول سرونٹ کو منتخب کیا' جو آکسفورڈ میں ایک سال پروبیشن پر گزار چکا تھا۔ وہ بنگالی تھا۔ دوسری لڑکی نے برماشیل کے ایک ملازم کو چنا' جسے کیمبرج سے ڈگری کے حصول کے فوری بعد نوکری مل گئی تھی۔ وہ پنجابی تھا۔ تیسری لڑکی نے احمد آباد کے ایک گجراتی ٹیکسٹائل مینوفیکچرر کے بیٹے کو چنا' جس نے اپنی مل کو جدید بنا کر خوب ترقی حاصل کی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی برہمن نہیں تھا۔ جب شادی کا موقع آیا تو وکٹر نے کہا: ''ہمیں اپنے ہم وطنوں کے لیے ایک مثال قائم کرنی چاہیے۔ ہم دولت کی نمائش نہیں کریں گے' بڑی بارات ہو گی نہ باجے گاجے ہوں گے' آتش بازی اور اس قسم کی دوسری فضول چیزیں نہیں ہوں گی۔ ہم واضح کر دیں گے کہ دولہوں کے گھرانوں کے افراد کے علاوہ اور کوئی شادی میں شرکت نہ کرے۔ ہم شادی کی تقریب سادگی سے منعقد کریں گے۔ کھانا بھی صرف ایک پکوان پر مشتمل ہو گا۔''

کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ یوں ایک سال کے اندر اندر مٹو کی

تینوں بیٹیوں کی شادی ہو گئی اور زیادہ تر لوگوں کو علم بھی نہیں ہوا۔ اب صرف وکٹر کنوارا رہ گیا تھا۔

''بیٹا' تمہارا کیا خیال ہے؟'' ایک روز اس کی ماں نے اس سے پوچھا: ''کیا میں اپنے پوتے کو اپنی گود میں نہیں کھلاؤں گی؟''

''ماں! کئی مرتبہ تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں ایسی لڑکی سے شادی کروں گا' جس کے بارے میں آپ یہ فیصلہ کریں کہ وہ آپ کی اچھی بہو بن سکتی ہے۔''

وکٹر محبت سے ناآشنا رہا تھا۔ رومانس کے لیے اس کے پاس وقت نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اسے اس کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی ماں سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی پسند کی لڑکی سے شادی کرے گا۔ اس کے پاس اپنی ماں کی خواہش پوری نہ کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

''میری نگاہ میں ایک لڑکی ہے'' اس کی ماں پرجوش ہو کر بولی: ''وہ میرے دور کے رشتے دار کی بیٹی ہے۔ وہ ایک گھریلو لڑکی ہے۔ پتا نہیں وہ تمہارے انگریزی طور اطوار' یہ سب کانٹا چھری والا سٹائل اپنا سکے گی کہ نہیں۔ وہ صرف میٹرک پاس ہے۔ اسے انگریزی بولنا نہیں آتا۔ تاہم تمام کشمیری لڑکیوں کی طرح وہ خوبصورت ہے۔ مجھے تو اس کا انکسار سب سے زیادہ پسند ہے۔ اگر تم اسے قبول کر لو تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔ اگر تم اسے رد کر دو گے تو کوئی بات نہیں میں کوئی دوسری کشمیری لڑکی ڈھونڈ لوں گی۔''

''ماں اگر وہ تمہیں پسند ہے تو میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔ اس کا نام کیا ہے؟''

''اس کا نام جے شری ہے' جے شری رائنہ۔ وہ چند ایک مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ ہمارے ہاں آ چکی ہے لیکن تم نے ان کو دیکھا تک نہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ وکٹر نے دو مرتبہ اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سکول کی لڑکی کی طرح لگتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ ان کے بہت بڑے گھر سے مرعوب ہو' جیسے کہ بہت سے ملاقاتی ہوتے تھے۔

''ماں تم پاپا سے بات کرو۔ اگر وہ راضی ہوں تو آپ لڑکی کی ماں سے بات کریں۔''

اس شام وکٹر کی ماں نے خاوند سے بات کی' اسے کافی توقع تھی کہ وہ سختی سے انکار کر دے گا۔ تاہم اس کے ردِعمل نے خوشگوار حیرت عطا کی۔

اس نے کہا: ''کم از کم ہمارے ایک بچے کی شادی تو کشمیری پنڈت خاندان میں ہو گی اور یوں ہماری نسل ختم نہیں ہو گی۔ ان کا خاندان معمولی ہے۔ وہ ہمارے طبقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ میرا خیال ہے اس کا باپ ایک کمیشن ایجنٹ ہے اور اسی گلی میں رہتا ہے جہاں بہت سے غریب کشمیری پنڈت گھرانے آباد ہیں۔ لیکن پیسہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہم اسے اپنی مالی حالت سدھارنے کے لیے اپنی اشیا فروخت کرنے کے لیے دو بڑی دکانیں دیں گے۔ اگر تمہارا بیٹا راضی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

مٹو اپنی بیوی کو گھر کے ایک گوشے تک محدود کرنے اور ویلیئر بوٹولی کو داشتہ بنانے پر احساس جرم کا شکار تھا۔ اگرچہ وہ ویلیری کے جسم میں کھویا ہوا تھا' تاہم اسے پتا تھا کہ اس کی بیوی اپنے کمرے میں روتی رہتی ہے۔ وہ اور باقی سب افرادِ خانہ انگریزی میں بات کرتے تھے' جو اسے نہیں آتی تھی۔ وہ انگریزی کھانے کھاتے تھے' جو اسے پسند نہیں تھے۔ اس نے اسے خاموشی اور تنہائی کی زندگی جینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ اسے اس کی پسند کی ساتھی مل جائے۔

وکٹر بھی ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ اسے شادی کرنے کی جلدی نہیں تھی۔ کالج

میں کچھ انگریز لڑکیوں سے واقفیت ہوئی تو اس نے شرم کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی جذباتی رشتہ قائم نہیں کیا۔ اس نے ان میں سے کسی کے ساتھ جنسی تعلق قائم نہیں کیا تھا کیونکہ وہ جنسی تعلق کو عارضی شادی سمجھتا تھا' جس سے دونوں فریقوں پر جذباتی حقوق واجب ہو جاتے۔ وہ موقع ملنے پر طوائفوں کے ساتھ وقت گزار لیا کرتا تھا۔ وہ اپنی جنسی خواہش پوری کر لیتا اور طوائف کو پیسے کے حصول کی خواہش پوری ہو جاتی۔ اس طرح نہ کوئی جذباتی بوجھ ہوتا نہ اور کچھ۔ اس نے کبھی کسی ہندوستانی عورت کے ساتھ جنسی عمل نہیں کیا تھا' نہ ہی کسی کنواری لڑکی کے ساتھ۔ وہ سوچتا تھا کہ کیا ان کے ساتھ کیا جانے والا جنسی عمل پکاڈلی سرکس یا بیس واٹررڈ کی طوائفوں کے ساتھ کیے گئے جنسی عمل سے مختلف ہوتا؟

اس بات کا مکمل امکان تھا کہ جے شری رانئہ ویسی بیوی ثابت ہوگی جیسی وہ چاہتا تھا۔ اس امر کا بہت کم امکان تھا کہ وہ اس سے برابری چاہے۔ وہ اس کی ماں جیسی ہوتی' جو اس کے باپ کے بچوں کو جنم دے کر گھر کے اپنے لیے مخصوص حصے میں چلی گئی تھی۔

وکٹر کی شادی بھی اس کی بہنوں کی شادیوں کی طرح سادگی سے ہوئی۔ کوئی شادی کارڈ نہیں چھپوائے گئے۔ صرف اس کی بہنوں اور ان کے خاوندوں نے دہلی آ کر شادی میں شرکت کی۔ شادی کی رسومات شانتی بھون میں ادا کی گئیں۔ شادی کی تقریب کے بعد جے شری کے والدین اپنی سب سے کم عمر بیٹی کو مٹو گھرانے کو سونپ کر رخصت ہو گئے۔

وکٹر نے جے شری کے ساتھ سہاگ رات کو ہی ہمبستری کی۔ وہ بمشکل سترہ سال کی اور کنواری تھی۔ اس کا خون بری طرح بہنے لگا تاہم اس نے کوئی شکایت کیے بغیر درد برداشت کر لیا۔ ان کے درمیان محبت کے الفاظ کا تبادلہ بالکل

نہیں ہوا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے درمیان بات چیت ہی بہت کم ہوئی۔ وکٹر ہر رات اور کبھی کبھی دوپہر کے وقت اس کے ساتھ ہمبستری کرتا۔ ان کے درمیان واحد رشتہ یہی تھا' اور چونکہ کسی کو بھی شادی سے اس جنسی رشتے سے زیادہ کسی شے کی توقع نہیں ہوتی اس لیے وہ مطمئن تھے۔ وکٹر نے اپنا وقت شانتی بھون دہلی اور جے بھگوان ٹاورز بمبئی میں تقسیم کر دیا۔ جے شری دہلی ہی میں رہی۔ وہ اپنا بیشتر وقت اپنی ساس کے کمرے میں گزارتی۔ جب وکٹر وہاں ہوتا تو اس کا زیادہ وقت اس کے کمرے میں گزرتا۔

شادی کے دو مہینے سے بھی کم عرصے بعد جے شری کے ایام میں پہلی بار تعطل ہوا۔ پھر دوسری مرتبہ ایسا ہوا۔ جب تیسری مرتبہ ایام متوقع تھے' ایک صبح وہ قے کرنے لگی۔ وکٹر کی ماں بہت خوش تھی۔ اس نے اپنی بیٹیوں کو خط لکھ کر یہ خوشخبری سنائی۔ اس نے انہیں لکھا کہ جلد ہی اس کی گود میں پوتا اور ان کا بھانجا آنے والا ہے۔ متو اپنے پوتے کی تعلیم کے بارے میں منصوبے بنانے لگا۔ وکٹر بھی اپنے وارث کی پیدائش کے امکان سے مسرور تھا۔

یہ خوشی عارضی نکلی۔ جے شری بیٹی کو جنم دیتے ہوئے مر گئی۔ یہ اس بڑے گھرانے میں پہلی موت تھی۔ وکٹر بہت زیادہ دکھی تھا۔ اس نے تو دس ماہ میں اپنی بیوی سے محبت بھرا ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ جب بھی شانتی بھون ہوتا' اسے یہی توقع ہوتی کہ وہ خواب گاہ میں اس کے آنے کی منتظر ملے گی — وہ دروازہ بند کر کے کپڑے اتارے گا اور اس پر چھا جائے گا۔ اس کے نازک بدن نے تو اسے حیران کر دیا تھا۔ وہ ابھی بچی ہی تھی! وہ سوچتا کہ اس نے عمر میں اپنے سے دگنے بڑے مرد کی مجنونانہ ضروریات کو پورا کرنا کہاں سے سیکھا تھا؟ کم عمر بیوی کی اطاعت نے اس کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ اسے کسی روز اپنے

جذبات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اور اس کے ساتھ اس سے بہتر سلوک کرنا چاہتا تھا جیسا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے ساتھ کیا تھا۔ اب دیر ہو چکی تھی۔ اس کا باپ عموماً خود پر قابو رکھا کرتا تھا لیکن اس صدمے سے وہ بھی نہایت دل گرفتہ تھا اور زندگی کے لیے اس کا جوش و ولولہ ختم ہو گیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ویلیری بھی اسے دلاسا نہ دے سکی۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ وکٹر کی ماں نے اسے یہ یقین دلایا کہ یہ بھگوان کی مرضی تھی۔ اگرچہ اس کی خواہش کے مطابق پوتا نہیں بلکہ پوتی پیدا ہوئی تھی' تاہم اس نے اسے بھی بھگوان کی مرضی قرار دیا اور اطمینان کے ساتھ اسے قبول کر لیا۔ اب وہ نوزائیدہ بچی کی نہ صرف دادی بلکہ ماں بھی تھی۔ اس نے بچی کے لیے ایک دایہ کا بھی بندوبست کیا۔

مٹو نے بچی کا نام بھارتی رکھا۔ وکٹر کی ماں بھارتی کو لمحہ بھر بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھی۔ دایہ اسے اپنی چھاتی سے دودھ پلاتی تو وہ اسے دیکھتی رہتی۔ جب بچی دودھ اگلتی تو وہ اسے کندھے سے لگا لیتی۔ وہ اسے نہلاتی دھلاتی' اس کے کپڑے تبدیل کرتی اور اپنے ساتھ سلاتی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ بھارتی کے ہاتھ اس کی چھاتیوں کو ٹٹولنے لگتے۔ تب وہ آہ بھر کر کہتی؛ ''بیٹی یہاں تمہارے لیے کچھ نہیں بچا۔ آیا! یہ بھوکی ہے' اسے دودھ پلا دو۔''

مٹو بھی اپنی پوتی کو بیحد پیار کرتا تھا۔ وہ بچی کے ساتھ گھنٹوں باتیں کرتا رہتا اور اسے ہنسانے کی کوششیں کرتا۔ ویلیری بھی دوسروں کی طرح اس کو پوجنے لگی تھی۔ وہ کہتی: ''بڑی خوبصورت بچی ہے۔ یہ تو بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔ اس کے خط و خال اپنے باپ جیسے اور رنگ ماں جیسا ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ بڑی ہو کر نہایت حسین نکلے گی۔''

بھارتی نے جو پہلے تین لفظ بولنا سیکھے' وہ تھے! دادی ماں' دادو اور گینی ما۔ وہ

یہ لفظ بالترتیب وکٹر کی ماں، مٹو اور ویلیری کے لیے بولتی تھی۔ چوتھا لفظ پاپی تھا، جو وہ اپنے باپ کو کہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ دوسروں کی نسبت کم وقت گزارتا تھا۔

☆☆☆

اب وکٹر دہلی اور بمبئی کے درمیان جلدی جلدی سفر کرنے لگا تھا۔ وہ روزانہ سولہ گھنٹے کام کرتا تھا۔ اس کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مٹو ستر سال کا ہو چکا تھا۔ اسے بہو کی موت سے شدید صدمہ پہنچا تھا اور وہ دفتری کام کاج سے لاتعلق ہوتا جا رہا تھا۔ وکٹر کو زیادہ بوجھ اپنے کندھوں پر لینا پڑا تھا۔ اس کا جہاز رانی کا کاروبار اس کی امید کے مطابق نہیں چل رہا تھا۔ نائر لندن سے واپس آیا تو وکٹر نے اسے جے بھگوان شپنگ کمپنی کا جنرل مینیجر بنا دیا۔ نائر نے ایک انگریز رکن پارلیمنٹ کی عوام میں بے عزتی کی تھی۔ پھر وہ اس سے ڈر کر ہندوستان لوٹ آیا تھا۔ وکٹر نے اسے ملازمت کے علاوہ جے بھگوان ٹاورز میں ایک بڑا فلیٹ بھی دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے کار مع ڈرائیور، لامحدود تفریحی الاؤنس اور اپنی مرضی کے لوگوں کو ملازمت دینے یا ملازمت نہ دینے کا اختیار دیا گیا تھا۔ تاہم نائر اس منصب کے لیے موزوں نہیں تھا۔ وہ تیز طبیعت کا شخص تھا اور اپنے سینئر منتظمین کے ساتھ اس کی نہ بن سکی۔ کہا جاتا تھا کہ اس نے اپنی ایک داشتہ کو ایک اہم عہدہ دے دیا ہے حالانکہ وہ محض ایک ٹائپسٹ تھی۔ اس پر کمپنی کے لیے جہازوں کی خریداری میں کمیشن لینے کا بھی الزام لگایا گیا۔ بمبئی کے کاروباری حلقوں میں اسے بدتمیز اور مغرور کہا جاتا تھا۔ کچھ سینئر افراد نے ملازمتوں سے استعفے دے دیئے اور وکٹر سے نائر کی شکایت کی۔ بہت سے گمنام خطوط میں نائر کے کرتوتوں سے پردہ اٹھایا گیا تھا۔ وکٹر نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اسے نائر کی وفاداری پر غیر متزلزل یقین تھا۔ اس نے اس کے خلاف ایک بھی لفظ سننے سے انکار کر دیا۔ حد تو یہ ہے کہ اس نے نائر کو انگلینڈ بھیجنے

کی اپنے باپ کی تجویز کو بھی رد کر دیا۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ وہ ہندوستان میں کمپنی کی بدنامی کا باعث بن رہا ہے۔

وکٹر جب بھی بمبئی میں ہوتا نائر اس کی بیحد خوشامد کرتا۔ وہ بڑی مہارت سے خوشامد کرتا تھا اس لیے وکٹر دوسروں کی نچھاور کی ہوئی تعریفوں سے زیادہ اس کی تعریفیں قبول کرتا تھا۔ اسے اپنے ساتھ نائر کے رویئے کی تبدیلی زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ نائر نے کبھی اس امر کو نہیں چھپایا کہ وہ اپنے آپ کو وکٹر سے دانش ورانہ سطح پر برتر تصور کرتا ہے۔ وہ وکٹر کی رہنمائی کر کے اور اسے کمیونزم پر لیکچر دے کر واضح طور پر اطمینان محسوس کرتا تھا۔ وہ کبھی وکٹر کے ساتھ بدتمیزی نہیں کرتا تھا تاہم کبھی کبھار اس کو ''بورژوا'' ہونے کا طعنہ ضرور دیا کرتا تھا۔ وہ خود ایک کمیونسٹ تھا اور پرانا سا کوٹ پہنا کرتا تھا۔ اس سے بھی اسے برتری کا احساس ہوتا تھا۔ وکٹر اس کے اس رویئے سے پریشان نہیں ہوتا۔ وہ تو لندن کے لبرل حلقوں کے اس ستارے کے ساتھ دوستی رکھنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ اب تو نائر وکٹر کو ایک ستارہ قرار دیتا تھا۔ وہ وکٹر کی ہر بات سے اتفاق کرتا اور کسی بھی معاملے پر اپنی رائے کا اظہار شاذ و نادر ہی کرتا تھا۔ وکٹر نے محسوس کیا تھا کہ جب نائر اس سے بات کرتا تو اس کی مٹھیاں بھنچ جاتیں اور وہ کبھی اس سے نظریں نہیں ملاتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وکٹر کی کامیابی نے ان دونوں کے درمیان تعلق کو تبدیل کر دیا تھا اور اسی امر نے نائر کو تلخ بنا دیا تھا۔ اسے اس حقیقت پر جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ اب وکٹر اس کا آقا ہے۔ اسے زیادہ غصہ اس امر پر آتا تھا کہ اس تعلق کو برقرار رکھنا اس کی ضرورت بھی تھی۔ وکٹر اس صورتحال سے بے خبر تھا۔ لوگ جب بھی نائر کے خلاف بات کرتے، وہ انہیں جھڑک دیتا یا ان کی باتیں سن کر بالکل خاموش رہتا۔ وہ نائر کی نااہلی سے پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کے لیے زیادہ کام کرتا۔ وہ ایسا شخص تھا جو اپنے کسی کام میں ناکام ہونے کا

اعتراف نہیں کرتا تھا۔ تاہم اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے اپنا زیادہ وقت دہلی کی بجائے بمبئی میں گزارنا تھا۔

وکٹر بمبئی کے بالائی طبقے کے معاشرے میں گھل مل نہیں سکا۔ بمبئی کے بالائی طبقے کے کاروباری افراد کا واحد مقصد پیسہ کمانا اور اپنے ورکروں اور انکم ٹیکس حکام کو دھوکا دینا تھا۔ وہ زیادہ نقد لین دین کرتے اور اس لین دین کو تحریر میں نہیں لاتے تھے۔ انہیں اپنے ملک کے مستقبل سے بہت کم دلچسپی تھی۔ وہ نہایت پرتعیش لیکن غیر نفاست پسندانہ زندگی گزارتے تھے۔ وکٹر ان سے دور رہتا تھا۔ تاہم شہر کے لوگ اس جیسے نہیں تھے۔ اس کے اور شہر کے عوام کے مزاج میں ایک بہت بڑا فرق تھا۔ اسے مہینے کے بہت سے دن بمبئی میں گزارنا ہوتے تھے اور وہ اس دوران کوشش کرتا تھا کہ بمبئی کے شہریوں سے جتنا کم ملے اتنا بہتر ہے۔ وہ اپنے دفتر سے بھی دور رہنا پسند کرتا تھا' جہاں لوگ مستقلاً نائر کی شکایتیں کرتے تھے۔ اس نے اس مسئلے کا ایک آئیڈیل حل ڈھونڈا تھا۔ جب وہ ایک مرتبہ جہاز خریدنے ملک سے باہر گیا ہوا تھا' تب اس نے سنا تھا کہ حال ہی میں مرنے والے ایک ارب پتی یونانی کی ایک کشتی برائے فروخت ہے۔ وہ کشتی دیکھنے ایتھنز گیا۔ وہ بغیر بادبانوں والی ایک موٹرائزڈ کشتی تھی۔ اس میں بارہ کیبن' ایک وسیع لاؤنج اور ایک ڈائننگ روم تھا۔ اس نے کشتی کا سودا کر لیا اور اس کے کیپٹن کو حکم دیا کہ کشتی بمبئی پہنچا دی جائے جہاں اس کا ہندوستانی عملہ اسے سنبھال لیتا۔

وکٹر وطن واپس آ گیا۔ وہ یوں خوش تھا جیسے اسے نئی بیوی مل گئی ہو۔ اس نے اپنے نئے کھلونے کی تصویریں اپنے گھر والوں کو دکھائیں اور بتایا کہ اس میں کتنے لوگ سفر کر سکتے ہیں' وہ کتنی تیزی سے چل سکتی ہے — کراچی سے بمبئی' بمبئی سے گوا' مدراس اور کلکتہ ساری جگہوں پر صرف ایک ہفتے میں پہنچ سکتی ہے!

''تم اس کا کیا کرو گے؟'' اس کی ماں نے سادگی سے پوچھا۔

''ماں! بھلا میں اس کا کیا کروں گا۔ میں اس میں رہوں گا۔ اپنے کاروباری معاملات انجام دوں گا' اجلاس منعقد کروں گا' پارٹیاں کروں گا۔ آپ تھوڑا انتظار کریں' پھر میں آپ کو دکھاؤں گا کہ یہ کشتی کیسی ہے۔ آپ کو اس سے محبت ہو جائے گی — نہ کوئی شور' نہ کیچ کیچ' نہ بدبو۔ صرف تازہ ہوا اور لامحدود سمندر۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب بمبئی آ کر اسے دیکھیں۔''

جب اسے کشتی کے پہنچنے کی خبر ملی تو اس نے سارے گھرانے کو بمبئی لے جانے کے لیے ایک ہوائی جہاز کرائے پر لیا۔ انہوں نے رات جے بھگوان ٹاورز کے پینٹ ہاؤس میں بسر کی۔ اگلی صبح وہ گیٹ وے آف انڈیا کے نزدیک واقع یاٹ کلب گئے' جہاں کشتی لنگرانداز تھی۔ وہاں ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ کسی نے بھی پہلے اتنی خوبصورت اور اتنی بڑی کشتی نہیں دیکھی تھی۔ وکٹر کی ماں پہلے ہی اس کے لیے نام چن چکی تھی: جل بھارتی۔

وکٹر نے اپنے گھر والوں کو کشتی کی سیر کرائی۔ انہوں نے کیبنوں کے دروازوں پر اپنے نام لکھے دیکھے۔ یہ کیبن ان کے لیے مخصوص کر دیئے گئے تھے۔ انہوں نے عرشے پر کھڑے ہو کر ہجوم کی طرف ہاتھ ہلائے۔ سائرن بجایا گیا اور پھر جل بھارتی یاٹ کلب آف انڈیا سے نکل کر ایلیفنٹا کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ ایک فیملی پکنک تھی۔ انہوں نے غاروں کی سیر کی اور دوپہر کا کھانا کشتی میں کھایا۔ ہر کوئی بہت پرجوش تھا۔ بھارتی سب سے زیادہ پرجوش تھی۔ وہ اب چار سال کی ہو چکی تھی۔ وہ ہر کسی کے پاس جا کر کشتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی: ''مائی سپ۔''

''ہاں بیٹا'' اس کی دادی ماں نے اسے یقین دلایا ''تمہارے پاپی نے اسے تمہارے لیے خریدا ہے۔''

وہ گوا چلے گئے۔ انہوں نے دو دن گوا کے ساحلوں پر سیر کرنے میں گزارے۔ ''اگر یہاں چند اچھے ہوٹل بنا دیئے جائیں تو دنیا بھر سے بہت زیادہ سیاح یہاں آنے لگیں گے۔ لیکن ایسا صرف تبھی ممکن ہے جب ہم پرتگیزوں سے چھٹکارہ پالیں۔ ان کا یہاں کیا کام۔ اب جنگ ختم ہو گئی ہے اور انگریز جلد ہی ہندوستان سے چلے جائیں گے۔ انگریزوں کو نکلنے دو' ہم فرانسیسیوں اور پرتگیزوں کو بھی نکال دیں گے۔'' وکٹر نے گاندھی کو اپنی نئی کشتی کے بارے میں خط لکھ کر بتایا۔ اسے معمول کے مطابق ایک پوسٹ کارڈ پر جواب ملا۔ گاندھی نے نرم انداز میں اسے جھڑکا تھا: ''ہمیشہ اپنے ملک کے غریبوں کا خیال رکھا کرو۔ اپنی کشتی کو کسی امیر آدمی کا کھلونا مت بناؤ۔''

وکٹر اپنے دفاع پر مجبور ہو گیا۔ اس نے باپو کو لکھا: ''باپو ملک کے مستقبل کے حوالے سے ہمارے تصورات کتنے ہی مختلف ہوں' لیکن آپ میرے لیے سرچشمۂ فیضان ہیں۔ آپ کو میرے مہنگے کھلونے کے حوالے سے مجھے جھڑکنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن میرا مقصد اس کھلونے سے کھیلنا نہیں ہے۔ میں تو پاگل کر دینے والے ہجوم سے دور اس کشتی میں اپنے کاروباری معاملات سرانجام دینا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے ہم وطنوں کے لیے جو تھوڑے بہت کام کیے ہیں' آپ تو ان سے واقف ہی ہیں۔ میں نے ایک لاکھ سے زیادہ مردوں اور عورتوں کو روزگار فراہم کیا ہے۔ میں نے انہیں مفت رہائش اور ان کے بچوں کو مفت تعلیم اور طبی سہولتیں دی ہیں۔ میں نے انہیں ریٹائرمنٹ کے بعد سہولیات اور پراویڈنٹ فنڈ دیئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان باتوں کو پسند کریں گے۔'' باپو نے ایک سطری جواب دیا: ''میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں۔''

آٹھواں باب

اس کے گھر والے ایک ہفتے بعد دہلی واپس چلے گئے۔ وکٹر بمبئی ہی میں رہ گیا۔ اس کے روزمرہ معمول میں چند تبدیلیاں آ گئیں۔ پہلے تو اس نے دن کا بیشتر وقت اور رات جے بھگوان ٹاورز میں گزاری اور ''جل بھارتی'' پر شام کے دو گھنٹے گزارے۔ پھر اس نے اپنا شیڈول تبدیل کر لیا۔ وہ راتیں کشتی پر گزارنے لگا۔ وہ اپنے دفتر میں چند گھنٹے گزارتا اور سہ پہر کو کشتی پر واپس چلا جاتا۔ اسے وہاں وہی سکون ملا' جو البیئن میوز والے فلیٹ میں تنہا گزارے ہوئے برسوں میں اسے ملا تھا۔ وہ کشتی پر تنہائی میں ہر معاملے کو زیادہ اعتماد کے ساتھ نمٹاتا تھا۔ اسے تنہائی زیادہ اچھی لگنے لگی۔ وہ اپنے بوڑھے والدین کو یہ بات نہیں سمجھا سکا۔ وہ اکثر اسے دوسری شادی کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ وہ ہر مرتبہ اس مشورے کو رد کر دیتا۔ اسے کسی ساتھی کی تلاش نہیں تھی۔ اس کے پاس کسی ساتھی کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ اگرچہ اسے کبھی کبھار کسی نوجوان عورت کے ساتھ جسمانی قربت کی شدید خواہش محسوس ہوتی' تاہم جب بھی کوئی لڑکی اسے لبھانے کی کوشش کرتی تو وہ اس پر توجہ نہ دیتا۔ وہ کسی لڑکی کو اپنی داشتہ بھی نہیں بنانا چاہتا تھا' کیونکہ کسی لڑکی کو داشتہ بنانے سے اس پر کچھ خاص ذمہ داریاں عائد ہو جاتیں۔ اس کے علاوہ افواہیں بھی پھیلتیں۔ اسی طرح کسی ہندوستانی طوائف سے اس کے میل جول پر بھی لوگ باتیں بناتے۔ بمبئی یا دہلی

میں طوائف بازی سے لندن، پیرس یا ہیمبرگ میں طوائف بازی بہتر تھی۔ بہرصورت اس کے ذہن پر جنس سے زیادہ اہم معاملات کا غلبہ تھا۔

بالآخر انگریزوں نے ہندوستان کو ہندوستانیوں کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم ملک کو تقسیم کر دیا گیا۔ برصغیر میں ایک طرف تو ہندوؤں اور سکھوں میں اور دوسری طرف مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں قتل و غارت ہوئی۔ وہ دریائے سندھ کے کناروں سے لے کر ہگلی کے پار تک ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگے۔ یہ وہ ہندوستان نہیں تھا جس کا خواب وکٹر اپنے بچپن سے دیکھ رہا تھا۔ جس روز ہندوستان نے آزادی حاصل کی وہ دہلی میں تھا۔ شہر پاکستان سے آنے والے ہندو اور سکھ شرنارتھیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مسلمانوں کو ان کے گھروں اور دکانوں سے نکال رہے تھے۔ انہوں نے قدیم یادگاروں میں ڈیرے ڈال لیے تھے۔ وہ فٹ پاتھوں اور راؤنڈ اباؤٹس میں پڑے تھے۔ اس کے باپ نے مزید محافظ بھرتی کر لیے۔ اس نے شرنارتھیوں کو اپنے باغ پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لیے بنگلے کے گیٹ بند کروا دیئے۔ وہ سخت تناؤ کا شکار تھا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا: ''ہم اس ملک پر حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں، انگریزوں کو یہیں رہنے دو ...... آزادی کی ساری باتیں ''بک بک'' ہیں ...... ہم غلامی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔'' اس سے بات کرنا بیکار تھا۔ جہاں تک باپو گاندھی کا تعلق ہے تو وہ مشرقی بنگال کی دور افتادہ بستیوں میں جا کر لوگوں کو تلقین کر رہا تھا کہ وہ سب مختلف ناموں سے پکارے جانے والے بھگوان کی اولاد ہونے کے ناطے مہذب انسانوں جیسا رویہ اپنائیں۔ خوش دکھائی دینے والا واحد فرد وکٹر کی چھوٹی سی بیٹی تھی۔ وہ آزاد ہندوستان کا تین رنگوں والا جھنڈا اٹھائے کسی فوجی کی طرح شانتی بھون میں مارچ کرتے ہوئے نعرے لگاتی:

''بھارت ماتا کی جے! مہاتما گاندھی کی جے!''

وکٹر نے دہلی میں یوم آزادی کی کسی تقریب میں حصہ نہیں لیا اور بمبئی واپس چلا گیا۔ بمبئی میں بھی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ ہر طرف ہندوستانی پرچم لہرا رہے تھے اور جلوس گلیوں میں نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔ ٹاٹا نے جے بھگوان ٹاورز پر ترنگا لہرا دیا تھا۔ اس نے عملے کی تواضع چائے اور سستے بسکٹوں سے کی۔ وہ بہت خوش تھا۔ وہ بمبئی کی ریاستی کمیٹی کا صدر بن گیا تھا۔ اس کا رکن پارلیمنٹ بن جانا یقینی تھا۔ وکٹر نے پینٹ ہاؤس میں ایک گھنٹہ گزارا اور پھر کسی کو بتائے بغیر اپنی کشتی پر چلا گیا۔ اس نے کیپٹن کو حکم دیا کہ کشتی کو سمندر میں اتنی دور لے جائے کہ زمین دکھائی نہ دے اور وہاں لنگر ڈال دے۔ وہ بالکل تنہا رہنا چاہتا تھا۔

وہ ہمیشہ سے زیادہ تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ جس ملک کے بارے میں اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کا وطن ہے، جس کے خوشحال مستقبل کی اس نے مضبوط بنیادیں رکھی تھیں، اسے انگریزوں، کانگرس اور مسلم لیگ نے ایسا بنا دیا تھا کہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ بالآخر سیاست جیت گئی تھی۔ اس کی ذاتی زندگی میں کچھ بری تبدیلیاں رونما ہو گئی تھیں۔ اس کے باپ کی صحت خراب تر ہو رہی تھی۔ آزادی اور شرنارتھیوں کی صورتحال نے اس پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ سب پر واضح ہو گیا تھا کہ وہ بہت بیمار ہے۔ وہ غائب دماغ ہو گیا تھا۔ اس پر ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ ان دوروں کے بعد وہ بہت زیادہ فعال ہو جاتا اور گھنٹوں بغیر رکے بولے چلا جاتا۔ اس کی واحد ساتھی بہادر ویلیئر بوٹو ملی تھی، جس نے اس کا دفتر چلانے، ڈاکٹروں کو بلانے، اسے وقت پر دوائیں دینے اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وکٹر کی ماں اپنے شوہر کی بڑھتی ہوئی بے بسی پر خوش دکھائی دیتی تھی۔ اگر اس نے ازدواجی زندگی میں اتنے طویل عرصے تک اس کی طرف سے بے حسی کے ساتھ لاتعلقی برتی تھی تو اب اسے کوئی حق نہیں تھا کہ وہ اس سے اپنی خدمت کرنے کی توقع رکھتا۔

زندگی میں اس کی واحد دلچسپی اس کی پوتی بھارتی تھی۔ وکٹر نے بھانپ لیا کہ اس کے باپ کے دن گنے جا چکے ہیں۔ تاہم اس نے اپنے باپ کی دلجوئی جاری رکھی۔ اب اس نے اس خیال سے سمجھوتہ کر لیا تھا کہ وہ کچھ عرصے بعد اس کے اردگرد موجود نہیں ہوگا۔

پہلے اسے کسی شخص کی ہمدردی کی ضرورت محسوس ہوا کرتی تھی۔ وہ شخص تھا اس کا پرانا دوست نائر۔ لیکن اب وہ تبدیل ہو گیا تھا۔ وکٹر نے اس کے حوالے سے بتائی جانے والی کسی بھی بات پر توجہ دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب بھی ایسی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ تاہم وہ دیکھ سکتا تھا کہ نائر اس کے نائب اور اس کی کمپنیوں کے جنرل مینیجر کی حیثیت سے زیادہ حیثیت کا خواہاں ہے۔ اس نے وکٹر کو کانگرس پارٹی کو بڑی رقوم چندے میں دینے اور بائیں بازو کے رسالوں کے مدیروں کی تواضع کرنے پر قائل کیا۔ یہ واضح تھا کہ وہ جے بھگوان انٹر پرائزز کے تعاون سے سیاست میں آنا چاہتا تھا۔ اس نے نائر کی راہ تو نہیں روکی لیکن وہ اس کے مستقبل کے منصوبوں کی تکمیل میں مدد دینے سے الگ ہو گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے پتا چلا کہ تنہائی کسے کہتے ہیں۔

☆☆☆

وکٹر کے بدترین اندازوں کو پورا ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ وہ اکتوبر کی ایک چمکدار صبح تھی۔ وکٹر کشتی کے عرشے پر کرسی پر بیٹھا تازہ سمندری ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اس نے ایک موٹر بوٹ کو ''جل بھارتی'' کی طرف آتے دیکھا۔ ''صاحب کے لیے ایک ارجنٹ ٹیلیگرام'' بوٹ کے پائلٹ نے چیخ کر کہا۔ وہ دہلی کی طرف سے ایک مختصر پیغام تھا: ''تمہارے والد کے دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے۔ اس کی حالت سنگین ہے۔ فوراً آ جاؤ۔ اپنی بہنوں کو اطلاع کر دو۔''

وکٹر نے کشتی کو واپس ساحل پر لے جانے کا حکم دیا۔ ساحل پر اس کی کار موجود تھی۔ اس نے اپنے سیکرٹری کو حکم دیا کہ ٹاٹا سے ایک پرائیوٹ ائیر کرافٹ کرائے پر حاصل کیا جائے۔ نائر نے اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ بعدازاں سہ پہر میں جب وہ دہلی کے پالم ائیرپورٹ پر اترنے کے بعد ائیرپورٹ بلڈنگ کی طرف جا رہے تھے' پریس فوٹوگرافروں اور رپورٹروں نے انہیں گھیر لیا۔ وکٹر نے بھانپ لیا کہ وہ جس واقعے کے رونما ہونے سے ڈر رہا تھا' وہ رونما ہو چکا ہے۔ اس نے رپورٹروں کو نظرانداز کر دیا اور لاؤنج سے گزرتا ہوا سیدھا اپنی کار تک پہنچا۔ وہاں مزید رپورٹر موجود تھے۔ نائر نے صحافیوں کو ڈانٹ دیا: ''تمہیں شرم نہیں ہے؟ انہیں ابھی ابھی اپنے والد کی وفات کی اطلاع ملی ہے اور تم ان کا انٹرویو لینا چاہتے ہو! یہ بے رحمی ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے!'' پھر اس نے وکٹر کا بازو تھاما اور اسے لے جا کر کار میں بٹھا دیا۔ پرانا نائر مختصر وقت کے لیے ابھر آیا تھا اور وکٹر کو انس اور تشکر کا احساس ہوا۔ وہ ایسے مشکل وقت میں کسی ہمدرد کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

پریس والوں نے اپنی کاروں میں اس کے گھر تک تعاقب کیا۔ اس کے گھر کی بیرونی سڑکیں اور لان غمگساروں سے بھرے ہوئے تھے۔ گورنر جنرل' وزیراعظم' وزیروں اور صنعت کاروں نے مٹو کی لاش پر ڈالنے کے لیے پھولوں کی چادریں بھیجیں۔ جونہی انہیں وکٹر کی آمد کی اطلاع ملی وہ اس کے ساتھ تعزیت کرنے کے لیے آنے لگے ___ اور ایسا کرتے ہوئے تصویریں کھنچوانے کے لیے۔ اس کا اور اس کے خاندان کا ذاتی دکھ تعلقات عامہ کی ایک مشق میں بدل گیا تھا۔

ویلیری بوٹولی نے ہجوم سے نکل کر وکٹر کو گلے لگا لیا۔ ''تم ہر کسی کے لیے تقویت کا سرچشمہ ہو۔ چلو میں تمہیں تمہاری ماں اور بیٹی کے پاس چھوڑ آتی ہوں۔'' وہ ہجوم سے نکلی اور اپنے کاٹیج میں چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی مزید ضرورت

کسی کو نہیں ہے۔

وکٹر نے جوتے اتارے اور ڈرائنگ روم میں چلا گیا' جہاں اس کے والد کی لاش فرش کے درمیان برف کی سلوں پر رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں اگربتی اور مرجھائے ہوئے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ پنڈت ایک کونے میں اشلوک پڑھ رہے تھے' جو بہت کم لوگوں کو سمجھ آرہے تھے' تاہم کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی ماں اپنے خاوند کے سرہانے بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ بھارتی اس کے پاس بیٹھی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ مٹو کا منہ آدھا کھلا ہوا تھا اور اس کے نتھنوں میں کپاس ٹھنسی ہوئی تھی۔ وکٹر نے فرش پر بیٹھ کر اپنی ماں اور بیٹی کو بانہوں میں بھر لیا۔ اس کی برداشت جواب دے گئی اور وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔ بھارتی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور رونا بند کر دیا۔ وہ صدمے کی کیفیت میں اسے تکے جا رہی تھی۔

''پاپی روؤ مت۔'' وہ بولی۔ ''آپ نے تو مجھے ڈرا دیا ہے' پاپی۔'' وکٹر نے اسے بانہوں میں بھر کر زور سے سینے سے لگا لیا اور وعدہ کیا' ''میں نہیں روؤں گا' میری بچی۔ ہم سب کو حوصلہ کرنا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں تم بھی اپنی دادی ماں کی خاطر حوصلے سے کام لو۔'' باپ بیٹی دونوں نے آنسو پونچھ لیے۔ جس وقت وہ آنسوؤں پر ضبط کر رہے تھے گورنر جنرل وکٹر سے تعزیت کرنے آ گیا۔ جب وہ غم زدہ آواز میں بات کرنے لگا تو سات سالہ بھارتی نے دربان کو حکم دیا کہ وہ صاحب سے پوچھے بغیر کسی کو کمرے میں نہیں آنے دے۔ ''میرے ابو بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ہمیں ان کی دیکھ بھال ضرور کرنی ہوگی'' اس نے حیران دربان کو مضبوط لہجے میں کہا۔ دربان نے ایڑھیاں جوڑیں' ننھی خاتون کو سیلیوٹ کیا اور بولا: ''جی میم صاحب!''

تعزیت کرنے والوں کے جانے کے بعد وکٹر ویلیری کے کاٹیج میں گیا۔

رات کے وقت اس کاٹیج کی صرف ایک کھڑکی روشن تھی' جس کی وجہ سے وہ گھر سے تھوڑے سے فاصلے پر ہونے کے باوجود بہت دور لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے وکٹر کے آنے کی توقع تھی۔ ''آؤ آؤ وکٹر۔ تم سکون پانے کے لیے دو ایک جام پی سکتے ہو۔ میں تمھیں چکن سینڈوچ بھی پیش کروں گی۔ مجھے پتا ہے کہ آج گھر میں کھانا نہیں پکایا جائے گا۔'' اس نے دو گلاسوں میں کافی ساری سکاچ ڈالی اس میں سوڈا ملایا اور ایک گلاس اسے دے دیا۔ وکٹر نے دیکھا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس نے پہلی مرتبہ غور کیا کہ وہ اب بوڑھی ہو چکی تھی۔

''اس نے اچھی اننگز کھیلی۔'' ویلیری نے خاموشی توڑی۔ ''وہ اپنے خاندان اور دوستوں کے لیے بہت اچھا تھا۔ وہ میرے ساتھ بہت اچھا تھا۔'' اس نے اپنی ایک آنکھ کے کونے سے آنسو پونچھا۔ ''وہ اچھے باپ تھے'' وکٹر نے جواب دیا۔ ''مجھ پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔''

وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہے۔ پھر ویلیری بولی: ''میرا خیال ہے کہ اب یہاں میری مزید ضرورت نہیں رہی۔ مجھے انگلینڈ واپس چلے جانا چاہیے۔ میرے والدین نوے کے پیٹے میں ہیں اور میری عمر بھی اب کافی ہو گئی ہے۔ بہرحال ہم میں رابطہ ضرور رہے گا۔ ہے نا؟''

''بالکل' بالکل!'' تم تو ہمارے خاندان میں شامل ہو۔ تم جب بھی لندن جاؤ تو البیمن میوز والے فلیٹ میں رہنا۔ تمھیں اچھا خاصا پراویڈنٹ فنڈ ملے گا۔ اس کے علاوہ تمھیں جب بھی کسی شے کی ضرورت ہو تو مجھے کہہ دینا۔''

''خدا تم پر کرم کرے' وکٹر۔ میرے پاس خدا' تمھارے باپ اور تمھاری مہربانی سے بہت کچھ ہے۔ میری فکر مت کرو' جا کر اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھو۔ اب تک تمھاری بہنوں کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

وکٹر جاتے وقت بولا: ''شکریہ ویلیئر۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے باپ کی زندگی میں خوشی لے کر آئی تھیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں اس کے لیے تمہارا شکرگزار ہوں۔''

ویلیری کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے دل پر سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو: ''تھینک یؤ وکٹر۔ خدا ہمیشہ تمہاری مدد کرے۔''

اس کی بہنیں اور ان کے خاوند اگلی صبح پہنچے۔ جنازے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ مٹو کی لاش کو ہردوار سے راتوں رات خصوصی طور پر لائے گئے پانی سے نہلایا گیا۔ اسے سر سے پاؤں تک سفید چادر سے ڈھانپ کر لکڑی کے دو تختوں پر لٹا کر رسی سے باندھ دیا گیا۔ جنازہ 8 بج کر 45 منٹ پر اٹھایا جانا تھا۔

وکٹر نے دیکھا کہ اس کی ماں نے اپنے بے وفا شوہر کے پاؤں چھوئے۔ لاش کو اٹھا کر جنازہ گاڑی پر رکھ دیا گیا۔ جب جنازہ روانہ ہوا تو وہ بچوں کی طرح رونے لگی۔ جب جنازہ گھر کے بیرونی گیٹ سے باہر نکلا تو پچاس کاریں اس کے پیچھے چلنے لگیں۔ جنازہ دریا کی طرف جا رہا تھا۔ سارے راستے میں پولیس والے ٹریفک کو روکے کھڑے تھے تاکہ جنازہ آسانی سے گزر جائے۔

دریائے جمنا کے کنارے پر بے شمار لوگ موجود تھے۔ وزیر اور جے بھگوان ٹیکسٹائلز کے ورکر اکٹھے موجود تھے۔ لاش پر پھولوں کی سینکڑوں چادریں چڑھائی گئی جنہیں بعد میں ہٹا دیا گیا۔ گیارہ بجے ایک جلتی ہوئی مشعل وکٹر کو دی گئی اس نے چتا کے گرد چکر لگاتے ہوئے کئی جگہوں کو آگ لگائی چتا تیزی سے جلنے لگی۔ ٹوٹتی ہوئی لکڑی اور برہمن پنڈتوں کی آوازیں عجیب سا سماں باندھ رہی تھیں۔ اپنے باپ کے جدا ہونے کے اس آخری مرحلے کو دیکھتے ہوئے وکٹر کے معدے میں درد کی ایک لہر

سی اٹھی۔ وہ درد کو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھارتی نے قریب آ کر اس کا ہاتھ اپنے ننھے سے ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ پرسکون ہو گیا۔

اس شام باپو گاندھی کی طرف سے ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا: ''موت زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ ہر کسی کو ایک مخصوص وقت پر موت آنی ہے۔ بہت زیادہ دکھی مت ہونا۔ صرف اپنے باپ کے ورثے پر ذہن کو مرتکز کر دو اور اسے مزید بڑھاؤ۔ ایسا کرنے سے تم زیادہ مضبوط ہو جاؤ گے۔ اس غم کی ساعت میں میری دعائیں تمہارے، تمہاری ماں، تمہاری بہنوں، تمہاری بیٹی اور دیگر افراد خانہ کے ساتھ ہیں۔ تمہارا باپو۔'' وکٹر نے کارڈ جیب میں رکھ لیا۔ یہ اس کی سب سے مسرت انگیز ملکیت ہو گا۔

ایک ہفتے بعد ویلیئر بوٹولی مٹو خاندان سے رخصت ہو گئی۔ وکٹر اور بھارتی اسے پالم ائیر پورٹ چھوڑنے گئے۔ اس نے دوبارہ کبھی ہندوستان نہیں آنا تھا۔ وکٹر کا جو بہنوئی آئی سی ایس میں تھا اور دہلی میں متعین تھا، اسے راضی کیا گیا کہ وہ وکٹر کی ماں اور بیٹی کی دیکھ بھال کے لیے اپنی بیوی بچوں سمیت ان کے مکان میں رہائش اختیار کر لے۔ وکٹر بمبئی واپس چلا گیا۔ باپ کی چتا کو آگ دکھانے اور راکھ کو دریائے گنگا میں بہانے کے تین ماہ بعد بھی اس کی کیفیت ابتر تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی المیہ رونما ہونے والا ہے۔ یہ احساس اسے سخت مضطرب کیے رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کام کی طرف مکمل توجہ نہیں دے پا رہا تھا۔ اس نے کام میں وقفہ ڈالنے کا فیصلہ کیا اور کشتی پر بمبئی سیر کے لیے روانہ ہو گیا۔ جب وہ گوا کے قریب لنگر انداز تھا تو اسے خبر ملی۔ وہ اپنے دوسرے باپ کو بھی کھو بیٹھا تھا۔ باپو گاندھی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ وہ بکھر کر رہ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا تعلق کتنی وحشی نسل کے ساتھ ہے کہ جس نے اپنے ہی سادھو صفت باپ کو قتل کر ڈالا تھا؟ اسے دلاسا دینے

والا کوئی نہیں تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس موقعے پر ایک پرتعیش کشتی میں گوا کے ساحل پر موجود رہنا مناسب نہیں ہے۔ وہ بمبئی واپس چلا گیا۔ اس کے سٹاف نے ایک ماتمی جلسہ منعقد کیا تھا۔ وہ اس جلسے میں شرکت کے بعد اپنی ماں سے ملنے دہلی چلا گیا۔ وہ بھی صدمہ زدہ تھی۔ وہ اپنا سر اپنے کمزور ہاتھوں میں تھامے مسلسل کہہ رہی تھی: ''یہ کل یگ ہے۔ لوگ خود اپنے باپوں کو قتل کر رہے ہیں! کون جانے وہ کب ہمارے لیے آئے گا۔ بیٹا اپنا خیال رکھنا۔ بہت برا زمانہ آ گیا ہے۔''

''میری فکر مت کرو، ماں۔ مجھے کون قتل کرے گا۔'' اس نے اپنی ماں کو تسلی دی۔ ''میں نے ابھی تک لوگوں کے لیے بھلائی کے اتنے زیادہ کام نہیں کیے ہیں۔''

وہ اس رات نگم بودھ گھاٹ گیا۔ وہ وہاں صبح تک بیٹھا سلگتی ہوئی چتاؤں کے بجھتے ہوئے انگاروں کو تکتا رہا۔ وہ موت کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔ صبح ہوئی تو وہ خود کو قدرے سنبھلا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ واپس جا کر ہندوستان کو خوشحال بنانے کی اپنی کوششیں دوبارہ شروع کرے گا، خواہ ہندوستان اس کا اہل تھا یا نہیں۔

نواں باب

کئی برس گزر گئے۔ وکٹر نے اپنے آپ کو کام میں غرق کر لیا تھا۔ وہ اپنی خواہش سے بھی زیادہ وقت جے بھگوان ٹاورز میں گزارتا اور سارے ملک میں موجود اپنی ملوں اور فیکٹریوں کے دورے کرتا۔ اس کا جہازرانی کا کاروبار زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ نائر زیادہ وقت سیاست کو دیتا تھا۔ وکٹر نے اسے ناراض کیے بغیر نئے اور اہل مینیجر ملازم رکھ لیے۔

وکٹر کی زندگی میں کام کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اس کا دوسرا خبط اس کی بیٹی بھارتی تھی۔ صرف ایک فون کال پر وہ اس کے پاس دہلی پہنچ جاتا' خواہ چند گھنٹوں ہی کے لیے سہی۔ بھارتی باپ کی غیر موجودگی میں بہت غمگین رہتی تھی۔ تاہم باپ اور دادی ماں کی توجہ نے اسے مضبوط اور پراعتماد بنا دیا تھا۔ اس نے دو سکولوں کو یکے بعد دیگرے ناپسند کیا اور پھر کسی بھی سکول میں پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اسے ٹیوٹر گھر میں پڑھاتے تھے تاہم اس نے کوئی بھی امتحان دینے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنی مرضی سے بہت مطالعہ کرتی تھی۔ جب وہ گفتگو کرتی تو سب پر حاوی ہو جاتی۔ وہ عموماً لوگوں کو کمتر بھی تصور کرتی تھی۔ یہ امر اس کی ظاہری وضع قطع سے عیاں ہوتا تھا۔ اس کی ظاہری وضع قطع غیر روایتی تھی۔ وہ اپنی عمر کی نسبت بہت لمبی اور بہت دبلی تھی۔ وہ کشمیریوں کی طرح زیادہ صاف رنگت والی بھی نہیں تھی۔ چونکہ وہ زیادہ

وقت اپنی دادی کے ساتھ گزارتی تھی اس لیے وہ چھری کانٹے اور شرابوں اور پنیروں وغیرہ سے دور رہتی تھی۔ اس کے کزن اس کے کھانے پینے کے طریقوں اور اس کے ڈھیلے ڈھالے لباس کا مضحکہ اڑاتے تھے۔ وہ انہیں نیم تعلیم یافتہ احمق تصور کرتے ہوئے نظرانداز کر دیتی تھی' حالانکہ ان کا مذاق اسے بہت برا لگتا تھا۔ جب اسے زیادہ غصہ آتا تو وہ انہیں ایسی کھری کھری سناتی کہ وہ ہفتوں اس سے دور رہتے۔ وہ پورے دہلی میں سب سے تیز زبان کی لڑکی تھی۔

ایک شام وکٹر سمیت تمام افرادِ خانہ شانتی بھون میں اکٹھے تھے کہ اس کی پھوپھیوں نے تجویز دی کہ اسے سوئٹزر لینڈ کے کسی ایسے سکول میں داخلہ دلوا دیا جائے' جہاں بچوں کو مہذب طور اطوار سکھائے جاتے ہیں۔ بھارتی نے زبردست احتجاج کیا لیکن انہوں نے اتنی موثر دلیلیں دیں کہ وکٹر ان سے متفق ہو گیا۔ اس نے کبھی اپنی پھوپھیوں کی اس خطا کو معاف نہیں کیا۔ اس نے ہمیشہ یاد رکھا کہ اس کی ایک پھوپھی نے کہا تھا: ''اسے مہذب اطوار سکھانے کی ضرورت ہے۔ بھائی! ہمارا خاندان اتنا اہم ہے کہ ہم کسی فرد کے غیرمہذب ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

جب بھارتی کو لاسین کے ایک اقامتی سکول میں داخلہ دلوایا گیا' تب وہ تیرہ سال کی تھی۔ اس نے وہاں چار سال گزارے۔ یہ عرصہ اس کی زندگی کا سب سے ناخوشگوار عرصہ تھا۔ اسے سردی' جراثیم زدہ ماحول اور الگ تھلگ رہنے والے لوگوں سے نفرت تھی۔ وہ خود بھی سرد مہر ہو گئی اور الگ تھلگ رہنے لگی۔ لیکن چونکہ اس نے باپ سے وعدہ کیا تھا' اس لیے اسے نبھایا اور جو تکالیف آئیں' انہیں برداشت کیا۔ اسے اس امر سے بہت سہارا ملا کہ وکٹر اسے ملنے اکثر و بیشتر سوئٹزر لینڈ آیا کرتا تھا۔ چار سال بعد اس نے اپنا سامان باندھا اور دہلی واپس پہنچ گئی۔ اگرچہ

اس کے پاپا نے اسے کہا تھا کہ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ آکسفورڈ سے تعلیم حاصل کرے لیکن اسے رسمی تعلیم سے اتنی نفرت تھی کہ اس نے مزید پڑھنے سے انکار کر دیا۔

''میں سوئٹزر لینڈ سے مہذب اطوار سیکھ آئی ہوں۔ آپ کی بہنوں کو مزید شرمندگی محسوس نہیں ہو گی۔ اب میں کہیں اور نہیں جاؤں گی' یہیں ہندوستان میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔''

وکٹر دم بخود رہ گیا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ اس کی بیٹی نے ان کی باتوں کو اتنا محسوس کیا تھا۔

اس نے کہا: ''آئی ایم سوری' مائی ڈیئر۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنی ناخوش ہو۔ ٹھیک ہے' تم یہیں رہو گی اور آکسفورڈ یا کسی اور جگہ مزید پڑھائی کی کوئی بات نہیں کی جائے گی۔''

بھارتی دوبارہ اپنی مرضی سے مطالعہ کرنے اور اپنی دادی ماں کے ساتھ وقت گزارنے لگی۔ یا پھر وہ اپنے کمرے میں یونہی لیٹی رہتی۔ اگرچہ وہ ایک خوبصورت دوشیزہ بن گئی تھی لیکن اس نے کسی ہم عمر لڑکے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس کا نہ کوئی دوست تھا نہ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی کو دوست بنانا چاہتی ہو۔ اس کی زندگی کا کوئی رخ نہیں تھا۔

اس کی سوئٹزرلینڈ سے واپس کے ایک سال بعد وکٹر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بیٹی سے اس کے مستقبل کے حوالے سے بات کرے۔ اس نے اسے چند دنوں کے لیے بمبئی چلنے کا کہا۔ اس نے کہا کہ وہ کشتی پر گوا اور کوچین جائیں گے اور ایک دوسرے کی قربت سے لطف اندوز ہوں گے۔ وہ آپس میں کم کم ہی ملتے تھے نا۔

بھارتی نے کہا: ''میں بخوشی چلوں گی۔ مجھے پرہجوم شانتی بھون پسند نہیں

ہے۔ سکون کے ساتھ گزرا ہوا وقت مجھ پر بہت اچھا اثر ڈالے گا۔ بعض اوقات مجھے لگتا ہے کہ یہاں میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

تین دن بعد وکٹر اور بھارتی بمبئی چلے گئے۔ وکٹر نے کشتی پر سفر کے دوران مطالعہ کرنے کے لیے اپنی کمپنیوں کی رپورٹیں اور بیلنس شیٹیں لے لیں۔ نائر نے بھارتی کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ اس نے اسے پھولوں سے لاد دیا اور اس کی شکل وصورت کی بہت تعریفیں کیں۔ وہ ایک خود پسند انسان تھا۔ بھارتی کی تیکھی ناک اور تیکھی زبان نے اسے اپنی نوجوانی یاد دلا دی تھی۔ بھارتی کسی مرد کی توجہ کی عادی نہیں تھی' بالخصوص کسی ایسے مرد کی' جو کہ اس کی باپ کا ہم عمر ہو۔ اس نے اس کی چاہت کا جواب خوشی کے ساتھ دیا۔

وکٹر اور بھارتی نے ایک ہفتے تک ہندوستان کے مغربی ساحلوں کی خوب سیر کی۔ وہ گوا اور کوچین میں ایک ایک دن اور رات ٹھہرے۔ یہاں سے انہوں نے کشتی میں ایندھن بھروایا' تازہ پھل' سبزیاں' مرغی اور مچھلی کا گوشت وغیرہ لیا۔ وکٹر نے زیادہ تر وقت اپنے کیبن میں ساتھ لائی ہوئی فائلوں کے دیکھنے میں اور اپنے تبصرے لکھنے میں گزارا۔ انہی میں اس کے سٹاف کے دو سینیئر اراکین کے دستخطوں کے ساتھ ایک رپورٹ تھی کہ کسی پہاڑی مقام پر ایک ہالیڈے ہوم خریدا جائے تا کہ ان کے گھرانے چھٹیوں میں وہاں قیام کر سکیں کیونکہ ہوٹل انہیں بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ وکٹر کو یہ آئیڈیا پسند آیا۔ اس نے اسے منظور کر لیا اور فائل پر لکھا: "ہر دوار کے نزدیک کوئی موزوں جگہ تلاش کی جائے۔ ماحول ایسا ہو' جو گرمیوں اور سردیوں میں ہمارے چھٹی منانے والے ملازمین کے لیے خوشگوار ہو۔ چارجز معمولی ہوا کریں گے۔ ایک کل وقتی باورچی اور تین دیگر ملازم رکھے جائیں۔ اس علاقے کی روایت کے مطابق کھانا صرف سبزیوں پر مشتمل ہوا کرے گا۔"

اس وقت اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہالیڈے ہوم اس کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔

بھارتی اپنے ساتھ ڈھیر ساری کتابیں اور رسالے لائی تھی۔ وہ زیادہ وقت عرشے پر بیٹھ کر مطالعے میں یا کشتی پر ٹہلتے ہوئے ساحلی مناظر اور کھلے سمندر کو دیکھنے میں گزارتی۔ کھانے کے وقت ان کی ملاقات ہوتی ــــ دوپہر کے ہلکے سے کھانے پر مختصر وقت کے لیے اور رات کے کھانے پر طویل وقت کے لیے۔ وکٹر سکاچ اور سوڈے کے دو جام پیا کرتا تھا۔ اس نے اپنی بیٹی کو ہلکی فرانسیسی شرابیں پینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ سوئٹزرلینڈ میں اس نے شرابوں کی زیادہ پروا نہیں کی تھی۔ یہاں اس نے انہیں کھانے سے پہلے اور بعد میں پرلطف پایا۔

جب بمبئی واپسی کا وقت آیا تو وکٹر نے اپنی بیٹی سے وہ بات کی، جس کے لیے اس نے یہ سارا انتظام کیا تھا: ''بھارتی! اب میں پچاس سے اوپر کا ہو گیا ہوں۔ مجھے پتا ہے، اس سے میں بوڑھا نہیں ہوا، تاہم اب مجھے اپنے شانوں پر پڑا کام کا بوجھ بہت بھاری محسوس ہونے لگا ہے۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے میرے پاس نہ مطالعے کا وقت بچتا ہے، نہ لکھنے اور آرام کرنے کا۔ اب تم اتنی بڑی ہو گئی ہو کہ میرا کچھ بوجھ بانٹ سکو۔ آخر تم میری واحد وارث ہو۔ میں خوش ہوں کہ تم نے اپنا وقت کالج جانے اور ڈگریاں یا ڈپلومے لینے میں ضائع نہیں کیا۔ زندگی میں ان کی افادیت بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ جو شے اہم ہے، وہ ہے عملی تجربہ۔ تم جتنی جلدی عملی تجربہ حاصل کر لو اتنا ہی بہتر ہے۔''

''آپ نے کیا سوچا ہے؟'' بھارتی نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم ساری فیکٹریوں کے دورے کرو۔ ہر فیکٹری میں ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ وقت گزارو۔ دیکھو کہ وہ کس طرح کام کر رہی ہے۔ یہ بھی

جائزہ لو کہ اسے جدید بنانے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ ہمیں ہر کسی سے ایک قدم آگے رہنا چاہیے۔ اس کے بعد ملک سے باہر جاؤ۔ مانچسٹر' شیفیلڈ' جرمنی اور امریکہ کا دورہ کر کے دیکھو کہ وہ ہم سے بہتر اشیا تو نہیں بنا رہے۔ ادویات سازی کا کام ہمارے ہاں زیادہ نہیں ہو رہا۔ ہم دوسرے درجے کا مال تیار کر رہے ہیں اور درآمدات پر بہت انحصار کرتے ہیں۔ ہمارے پاس بجلی نہیں ہے' ہمیں اپنی ریلوے کو جدید بنانا ہوگا' جرمنی اور اٹلی جیسی کھلی سڑکیں بنانا ہوں گی۔ فہرست لامختتم ہے۔ انگلینڈ سے آغاز کرو۔ البین میوز میں ہمارا ایک عمدہ فلیٹ ہے۔ تم وہاں رہتے ہوئے کام کرسکتی ہو۔ اپنی مدد کے لیے ایک سیکرٹری رکھ لینا۔''

بھارتی اس سے اتفاق کے اظہار کے لیے سرہلاتی رہی۔ اس کی باتوں کے دوران وہ اس عظیم نئی دنیا کو تصور میں دیکھتی رہی جسے وہ خود کسی کی نگرانی کے بغیر' تنہا دریافت کرنے والی تھی۔

☆☆☆

بھارتی نے اگلے چند مہینے ہوائی جہاز' ٹرین اور کار کے ذریعے ہندوستان کا دورہ کرنے میں گزارے۔ اس نے اپنے باپ کی لگائی ہوئی ساری فیکٹریوں کا دورہ کیا۔ سٹاف اور ورکروں نے اس کا بہت اچھا خیر مقدم کیا۔ اس نے حالاتِ کار کا جائزہ لیا اور ورکروں اور ان کے گھرانوں کی مشکلات سنیں۔ ورکر اس کے مہذبانہ اطوار سے بہت متاثر ہوئے۔ اس نے زیادہ باتیں تو نہیں کیں لیکن اس نے ان کی باتیں غور سے سنیں اور وعدہ کیا کہ وہ ان کی پریشانیوں سے اپنے باپ کو آگاہ کر دے گی۔ اس کے رویے نے بہت سے لوگوں کو وزیراعظم کی بیٹی یاد دلا دی' جو اپنے باپ کے ساتھ ملک بھر کے دورے کرتی تھی۔ اگرچہ بھارتی معمولی سی چپل پہنے ان کے سادہ سے گھروں میں گئی اور انہی کی طرح تیز دھوپ میں پھرتی رہی لیکن انہیں

اس میں بے بھگوان جیسی محبت محسوس نہیں ہوئی۔ تاہم جو بھی تھا' وہ ان کے لیے آسمانی مخلوق تھی' ایک دیوی تھی۔

بمبئی واپسی سے پہلے بھارتی نے ہردوار اور رشی کیش کے درمیان دریائے گنگا کے دائیں کنارے پر ایک راجہ سے خریدے گئے ہالیڈے ہوم میں ایک ہفتہ گزارا۔ بھارتی سرسبز پہاڑیوں کے درمیان تعمیر کیے گئے اس مکان سے بہت متاثر ہوئی۔ پہاڑیوں سے گزرتے دریا کے پانی کی مدھر آواز مکان میں سنائی دیتی تھی۔ یہ مکان تہری گڑھوال جانے والے مین روڈ سے تقریباً ایک میل دور تھا۔ اس کے نزدیک ترین عمارت ایک آشرم تھا' جسے ایک تانتری عورت چلاتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس پالتو چیتا' بہت سے کالے کتے اور چند چیلے ہیں۔

بھارتی نے فون پر اپنے باپ کو اس جگہ کے بارے میں شاعرانہ انداز میں بتایا: ''یہ ایسی جگہ ہے جہاں میں اپنی ساری زندگی گزار دینا پسند کروں گی — دریا' پہاڑی' سبزہ اور سکون۔ میں یہاں اتنی ہی خوش ہوں گی' جتنی کہ آپ اپنی کشتی پر ہوتے ہیں۔'' وکٹر نے ہالیڈے ہوم کا نام اس کے نام پر ''بھارتی بھون'' رکھنے کا فیصلہ کیا۔

ادھر وکٹر نے اس کی غیر حاضری کے دوران یورپ میں اپنے کاروباری ساتھیوں کو خط لکھ کر اطلاع دے دی تھی کہ اس کی بیٹی وہاں آنے والی ہے۔ انھوں نے جواب میں اسے یقین دہانی کرائی کہ اس کا پرجوش خیر مقدم کیا جائے گا اور ہر ممکن معاونت کی جائے۔ نائر نے مشورہ دیا کہ اسے صرف مالی مفادات کے حصول تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں سے ملنا چاہیے' پکچر گیلریوں کی سیر کرنی چاہیے' ڈرامے اور بیلے پروگرام دیکھنے چاہئیں اور کلاسیکی موسیقی کی محفلوں میں شرکت کرنی چاہیے۔

اس نے کہا: ''اسے اپنے آفاق کو وسعت دینی چاہیے۔ وہ ہندوستان کی ایک غیر سرکاری سفیر ہو گی۔ اسے انگریزوں سے اپنی انفرادیت منوانی چاہیے۔''

وکٹر کو نائر کی باتیں اچھی لگیں۔ نائر نے مزید کہا: ''اگر تم پسند کرو تو میں اس کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ میں دو ہفتے لندن میں رہ کر اسے ان سیاستدانوں، شاعروں اور ادیبوں سے متعارف کروا دوں گا، جن سے میں لندن کے قیام کے دوران واقف ہوا تھا۔ یہ اس کا آغاز ہو گا۔ اس کے بعد وہ معاملات کو خود سنبھالنے لگے گی۔''

وکٹر اس کی اس بات سے بھی متاثر ہوا۔ اس نے کہا: ''میں اس بارے میں بھارتی سے پوچھوں گا، دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔''

بھارتی نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ ''میں تو کسی ساتھی کے بغیر اجنبی جگہ پر کھو ہی جاؤں گی۔ نائر کا ساتھ بہت بہتر رہے گا۔''

اس کے باپ نے اسے تنبیہہ کی: ''خیال رکھنا۔ وہ بڑا جھگڑالو آدمی ہے۔ وہ لوگوں سے جلد الجھ پڑتا ہے۔ تمہیں اس حوالے سے ہوشیار رہنا ہو گا۔''

''مجھے تو وہ جھگڑالو نہیں لگا۔'' بھارتی بولی۔ ''وہ میرے ساتھ تو بہت مہذب رہا ہے۔''

''پھر نہ کہنا میں نے تمہیں خبردار نہیں کیا تھا'' وکٹر نے کہا۔ ''میں اسے کالج کے زمانے سے جانتا ہوں۔ میں تو ہمیشہ اسے بہت پسند کیا کرتا تھا، لیکن دوسرے بہت کم لڑکے اسے پسند کرتے تھے۔''

چند دن بعد بھارتی اور نائر لندن پہنچ گئے۔ نائر ہندوستان میں عمومی طور پر کیرالہ طرز کا کرتہ اور ٹخنوں تک لمبی سفید براق مندو پہنا کرتا تھا۔ لندن میں اس نے سیوائل روکا سوٹ پہنا اور ریشمی ٹائی باندھی۔ بھارتی نے لندن کی دسمبر کی سردی سے

بچنے کے لیے ایک قیمتی شاہ توش شال اوڑھ لی۔ اگرچہ ان کی عمروں میں بہت فرق تھا' لیکن ان کا جوڑا بہت دلکش لگ رہا تھا۔

نائر بہت مہذب بن گیا تھا۔ وہ ہر صبح اسے جگانے کے لیے البیین میوز آتا۔ اس کے پاس سرخ گلابوں کا گلدستہ اور ایک چھپا ہوا کارڈ ہوتا۔ کارڈ پر اس دن کا شیڈول ہوتا تھا: ''ٹیٹ گیلری کی سیر' وزیر خارجہ کے ساتھ سیوائے میں لنچ۔ ٹاور آف لندن کی سیر' دی آبزرور کے ایڈیٹر کے ساتھ ڈنر' تھیٹر جا کر اگاتھا کرسٹی کا ڈرامہ ''ماؤس ٹریپ'' دیکھنا......'' شیڈول ہر روز مختلف ہوتا تھا۔ انہوں نے پندرہ دنوں کے لیے ایک رولز رائس کار کرائے پر لے لی تھی۔ بھارتی روزانہ نائر کو یوسٹن سٹیشن کے نزدیک اس کے فلیٹ چھوڑ آتی تھی۔ یہ فلیٹ اس نے آکسفورڈ سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد خریدا تھا۔

اگرچہ نائر نے بھارتی کو بھرپور توجہ دی تاہم وہ دن کی پہلے سے طے شدہ مصروفیات میں ہمیشہ اگلے پروگرام پر عمل کے لیے بے چین رہتا تھا۔ وہ لنچ اور ڈنر میں ٹماٹروں کے شوربے کے علاوہ بہت کم کچھ کھاتا تھا۔ البتہ چائے وہ بے تحاشا پیا کرتا تھا۔ لندن نے اس پر کچھ کر دیا تھا: وہ تیس سالہ نائر بن چکا تھا۔ کھانے کے دوران جب دوسرے کھانا کھا رہے ہوتے' وہ چمچوں اور کانٹوں کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ وہ اپنی پلیٹ میں موجود پکوان کو الٹتا پلٹتا رہتا' یہاں تک کہ کھانا میز سے اٹھا لیا جاتا۔ ایک دن کھانے کے دوران بھارتی نے کہا: ''نائر اگر تم کچھ کھاؤ گے نہیں تو بھوک اور سردی سے مر جاؤ گے۔'' یہ کہہ کر اس نے نائر کی پلیٹ ابلی ہوئی سبزیوں سے بھر دی۔

نائر نے مسکراتے ہوئے کہا: ''کیا میں تمہیں فاقہ زدہ دکھائی دیتا ہوں؟ تم لوگ بہت زیادہ کھاتے پیتے ہو۔ ذرا گاندھی کو یاد کرو۔ وہ دودھ کا ایک گلاس پیتا تھا'

کھجوریں اور بادام کھاتا تھا۔ اس کے باوجود اس میں اتنی توانائی تھی کہ وہ انگریز سلطنت سے اس کے اقتدار کے عروج پر ٹکرا گیا تھا۔"

"یہ ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے — میں اسے گزشتہ تیس برسوں سے جانتی ہوں۔" کھانے پر مدعو نائر کی ایک گرل فرینڈ نے مسکراتے ہوئے کہا: "اس کی کسی پرانی گرل فرینڈ سے پوچھو۔ ہر کوئی اس کو ماں کی طرح چاہتی تھی۔"

بھارتی نے سنا ہوا تھا کہ نائر کی بہت سی انگریز گرل فرینڈز تھیں۔ کچھ کا تعلق امیر خاندانوں سے تھا۔ انہیں اس کا سادھوؤں جیسا طرز زندگی پرکشش لگتا تھا۔ وہ اس کی دیکھ بھال کر کے خوش ہوتی تھیں۔ اگرچہ بھارتی اتنی کم عمر تھی کہ اس کی بیٹی لگتی تھی، تاہم وہ بھی اس کے ساتھ ماں جیسا برتاؤ کرنا چاہتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کہیں سیر پر جاتے وقت وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے اسے سردی سے کپکپاتا دیکھتی تو اس کے لیے بہت زیادہ ہمدردی محسوس کرتی۔

ایک رات اس نے کار میں اس سے کہا: "تمہارے ہاتھ تو ٹھنڈے برف ہو رہے ہیں۔ لو اپنے ہاتھ اور گھٹنے میری شال سے ڈھانپ لو۔ یہ دنیا کی گرم ترین شال ہے۔" دونوں نے ایک ہی شاہ توش اوڑھ لی اور ہاتھ اس کے اندر کر لیے۔ نائر کے ہاتھ گوشت سے محروم کسی جانور کے پنجوں جیسے تھے۔ بھارتی کے ہاتھ گرم اور نرم تھے۔

کرسمس کے دن وہ لندن میں ہی تھے۔ اس دن شہر سنسان دکھائی دیتا تھا۔ نائر نے ایٹن تک ڈرائیو کی تجویز پیش کی تاکہ بھارتی وہ سکول دیکھ سکے جہاں اس کا باپ پڑھتا تھا۔ سکول تو بند ہوتا لیکن وہ اس کی عمارت اور ونڈسر کیسل دیکھ سکتے تھے۔ بھارتی فوراً تیار ہو گئی۔ یہ نائر کا بھارتی کے ساتھ آخری دن تھا۔ اسے اگلی صبح ہندوستان واپس چلے جانا تھا۔ بھارتی کو اس کے ساتھ لمبی ڈرائیو کا آئیڈیا بہت پسند

آیا۔ وہ اس سادھو صفت شخص کو پسند کرنے لگی تھی' جس نے اسے اپنا بہت سا وقت دیا تھا۔ وہ ایک روشن دن تھا' اس کے باوجود بھارتی نے اسے اپنی شال اوڑھا دی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ابھی سے اس کی کمی محسوس کرنے لگی تھی۔

جب وہ واپس پہنچے تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ گرجا گھروں میں شام کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ بھارتی نے گیس کی آگ روشن کی اور نائر کے لیے چائے بنائی۔ اس نے چائے کے ساتھ نمکین بسکٹ میز پر رکھ دیئے۔ جب وہ چائے بنا رہی تھی تب نائر گیس کی آگ سے ہاتھ تاپ رہا تھا۔

اس نے بھارتی کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے ہوئے کہا:

''اب میرے ہاتھوں کالمس محسوس کرو' کسی ٹوسٹ کی طرح گرم۔''

وہ اس کے قریب آ گئی۔ نائر نے اس کا ماتھا چوم لیا۔ وہ دونوں میز کے گرد پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نائر چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے نمکین بسکٹ تھوڑا تھوڑا توڑ کر کھانے لگا۔ بھارتی وائٹ وائن تیزی سے پی رہی تھی۔ وہ کبھی کبھار ہی دو چھوٹے گلاسوں سے زیادہ پیا کرتی تھی۔ آج وہ دو گلاس پینے کے بعد تیسرا گلاس پینے لگی۔ سارے دن کی تھکن اور خالی معدے کی وجہ سے وائن اسے چڑھ گئی۔ اس کی زبان بولتے بولتے لڑکھڑانے لگی۔ اس نے نائر کو گھڑی پر نگاہ ڈالتے دیکھ لیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولی: ''تمہیں جانے کی جلدی ہے۔ ابھی کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔''

''ینگ لیڈی! میرا خیال ہے آپ کچھ نشے میں ہیں'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ مخمور لہجے میں بولی: ''میں تھوڑی دیر کے لیے لیٹ رہی ہوں۔ تم بھاگ مت جانا۔''

وہ بستر پر لیٹ گئی۔ نائر اس کے سرہانے بیٹھ کر اپنا پنجہ نما ہاتھ اس کی

پیشانی پر پھیرنے لگا۔ پھر اس نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر اس کے ہونٹ چوم لیے۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ اسے پرے دھکیل دے گی۔ لیکن ہوا اس کے الٹ۔ بھارتی نے اس کے بال پکڑ کر اپنے ہونٹ زور سے اس کے ہونٹوں میں پیوست کر دیئے۔

''ینگ لیڈی'' وہ اپنا ہاتھ اس کی چھاتیوں پر لے جاتے ہوئے بولا: ''میں جانے سے پہلے آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''مجھ سے محبت کرو۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے کبھی کسی نے محبت نہیں کی۔''

نائر کو مزید بلاوے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنے ساتھ کی گئی وکٹر کی اچھائیوں کا صلہ دینا چاہتا تھا۔ اس کی کم عمر لڑکی سے ہمبستری کرنا اپنے محسن سے حتمی انتقام ہوتا۔ اس نے پہلے بھارتی کو بے لباس کیا' پھر اپنے کپڑے اتار دیئے۔ وہ اس کی جوان چھاتیوں کو چوسنے لگا' یہاں تک کہ وہ جنسی عمل کے لیے پوری طرح تیار ہو گئی اور اس پر جنون سا طاری ہو گیا۔ اس نے دخول کیا۔ ''آ اُچ'' وہ چیخی۔ ''لیکن رکنا مت۔'' اس نے اپنی طرف سے بہترین عمل کیا۔ پھر بھی وہ اپنی ساتھی کی خواہشات پوری نہیں کر سکا۔ چند زوردار جھٹکوں کے بعد وہ ختم ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی اپنے ٹراؤزر کے بٹن بند کیے اور فلیٹ سے نکل گیا۔ وہ سڑک پر نکلا تو زور زور سے ہنسنے لگا۔ اسے ہنستا دیکھ کر اپنے کتے کے ساتھ ٹہلنے والی ایک بوڑھی لیڈی حیران ہو گئی۔ بہت سال پہلے کرسمس کے موقعہ پر اس کے باپ نے اسی بستر پر لندن کی ایک طوائف کے ساتھ اپنا کنوار پن گنوایا تھا۔ بہت سال بعد بھارتی نے اسی بستر پر اپنی دوشیزگی کھوئی۔

❁❁❁

دسواں باب

جب بھارتی اور نائر لندن میں تھے' تب وکٹر دہلی میں اپنی ماں سے ملاقات کے دوران بیمار ہوگیا۔ ایک صبح وہ نہا رہا تھا کہ اس کے سینے میں شدید ترین درد ہوا۔ وہ فرش پر گر گیا۔ ڈاکٹر نے انجائنا تشخیص کیا اور اسے تسلی دی کہ اسے کوئی خطرہ نہیں ہے بشرطیکہ وہ اپنی خوراک میں احتیاط کرے' تھوڑی بہت ورزش کیا کرے اور تجویز کردہ ادویات باقاعدگی سے استعمال کرے۔ تاہم وکٹر ہل کر رہ گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ابھی اس کی مرنے کی عمر تو نہیں ہے۔ اس پر موت کا خوف طاری ہوگیا۔ اس نے وصیت لکھی اور بمبئی میں اپنے وکیل کو بھیج دی۔ اسے کسی بھی موضوع پر ذہن مرتکز کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید اپنے نئے حاصل کردہ ہالیڈے ہوم میں چند دن گزارنے سے اس کی حالت بہتر ہوجائے۔ اگر وہاں اس کا جی نہ لگتا تو وہ چند گھنٹوں میں واپس آسکتا تھا۔ اگلے دن وہ کار کے ذریعے ہردوار روانہ ہوگیا۔ دوسری کار میں اس کا سیکرٹری' باورچی اور بیرا آرہے تھے۔ دوپہر تک وہ ہردوار سے گزر چکے تھے۔ رشی کیش سے پہلے وہ دریا کی طرف مڑ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی منزل آ گئی۔ وکٹر منظر کو دیکھتے ہی خوش ہوگیا: سفید دو منزلہ مکان اور پھولوں بھرا وسیع وعریض لان دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اس منظر نے اسے بے حد سکون عطا کیا۔ ہالیڈے ہوم کے دربان اور مالی نے اس

کے پیر چھوئے اور اسے اندر لے گئے۔ اندر ایک بڑا استقبالیہ ہال تھا' ایک طرف ڈائننگ روم تھا۔ مکان میں تین بیڈروم تھے۔ ہر ایک کے ساتھ باتھ روم تھا۔ ایک چوڑا زینہ بالائی منزل کی طرف جاتا تھا۔ بالائی منزل پر بھی دو بیڈروم اور ایک ڈرائنگ روم تھا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ایک بالکونی تھی جہاں سے پہاڑوں اور وادی میں بہتے ہوئے دریا کا شاندار منظر دکھائی دیتا تھا۔ وکٹر اس منظر کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ ''نہایت حسین!'' اس نے دربان سے کہا: ''مجھے جلد ہی یہاں آنا ہوگا۔''

''یس سر۔ راجہ صاحب ہر شام اندھیرا چھا جانے تک یہاں سے دریائے گنگا کا نظارہ کیا کرتے تھے۔ وہ اسے کبھی نہ بیچتے' بھائیوں کے ساتھ مقدمے بازی اور ریاست پر حکومت کے قبضے کے بعد انہیں اسے بیچنا پڑا۔'' دربان نے جواب دیا۔وکٹر نے بالکونی میں بیٹھ کر چائے پی۔ وہ وہاں سے پہاڑوں کا نظارہ کرتا رہا' یہاں تک کہ اس کے ذہن سے ہر فکر دور ہوگئی۔ وہ تب تک وقت وہاں بیٹھا رہا جب تک سورج اس پہاڑی کے پیچھے غروب نہیں ہوگیا' جس پر اس کا مکان تعمیر کیا گیا تھا۔ تیسری تاریخ کا چاند سیاہی مائل نیلے آسمان پر شام کے ستارے کے ساتھ نظر آنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ ہوا کے ساتھ کسی بستی سے بانسری کی مدھر تانیں سنائی دینے لگیں۔ بانسری کی آواز مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی۔ رفتہ رفتہ اندھیرا گہرا ہوگیا۔ وکٹر اٹھ کر اندر آ گیا۔

تیل کے لیمپ روشن کردیئے گئے تھے۔ دربان چائے کی ٹرے اٹھائے آیا۔ ''سر بجلی نہیں ہے۔ بجلی ایک گھنٹے بعد آئے گی۔ میں نے آپ کے بستر کے ساتھ والی میز پر ٹارچ رکھ دی ہے۔ آپ کے باتھ روم میں بھی لالٹین رکھ دی ہے۔ میں فرشی منزل پر سو رہا ہوں۔ جب چاہیں مجھے آواز دے کر بلا لیں۔ میں حاضر

ہو جاؤں گا۔"

وکٹر کے ذاتی خادم نے اس کے لیے سکاچ کی بوتل، سوڈا اور برف نکالی۔ دیہاتی علاقے میں طویل سفر، تازہ پہاڑی ہوا اور بانسری کی تانوں نے اسے بہت مسرور کر دیا تھا۔ تیل کا لیمپ روشن تھا۔ اس کے گرد بھنورے منڈلا رہے تھے۔ دریا کے بہنے کی مدھر آواز آ رہی تھی۔ ان سب نے مل کر ایک رومانوی فضا تخلیق کر دی تھی۔ اس نے سکاچ کا گھونٹ بھرا۔ حلق سے نرمی سے اترتی سکاچ نے اسے حرارت دی۔ وہ موت کے خوف سے آزاد ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ زندگی بہت خوبصورت ہے۔ اگر اس میں موت بھی ہے، تو کیا ہوا۔ اس کو صرف یہ خواہش تھی کہ کاش وہ اس جگہ پر پہلے آ گیا ہوتا۔ اس جگہ نے تو اسے آدھے دن ہی میں بحال کر دیا تھا۔ رات کو ہلکا سا کھانا کھانے کے بعد وہ مچھر دانی کے تلے بستر میں لیٹ گیا۔

اس نے اگلے دو دن دیہاتی علاقے اور دریا کے کنارے پیدل سیر کرتے ہوئے گزارے۔ اس نے تیز بہتے ہوئے پانی میں ہاتھ ڈبوئے اور منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ پانی یخ ٹھنڈا تھا۔ وہ اس آشرم کے پاس سے گزرا، جس کے بارے میں بھارتی نے اسے لکھا تھا۔ آشرم ہالیڈے ہوم سے چند گز دور تھا۔ اس کے دروازے بند تھے۔ لوہے کے سیاہ گیٹ کی ایک طرف شیر پر سوار درگا دیوی کا مجسمہ نصب تھا۔ دوسری طرف انگریزی میں نوٹس لگا ہوا تھا: "اندر آنا منع ہے۔ شیر سے خبردار رہیں۔"

واپس پہنچ کر اس نے دربان سے آشرم کے بارے میں پوچھا: "سر، یہ ماں درگیشوری کا آشرم ہے۔ وہ ایک طاقتور تانتری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہمالیہ کے ایک غار میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کے پاس شیرو نامی شیر ہے، جس کے بارے میں

مَیں نے سنا ہے کہ وہ سبزی خور ہے۔ وہ پالتو کتے کی طرح ہر جگہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہے۔ وہ روزانہ اسے اپنے ساتھ دریائے گنگا پر لے جاتی ہے اور دونوں اکٹھے نہاتے ہیں۔ لوگ ان کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ وہ اسے ''شیروں والی ماں'' کہتے ہیں۔ اس کے درشن کے لیے آپ کو پہلے اس کی مہا چیلی سے ملنا ہو گا' جو کہ ایک انگریز عورت ہے۔''

وکٹر نے اگلے دن صبح سویرے اسے اپنی بالکونی سے دیکھا۔ وہ پہاڑی سے نیچے اتر رہی تھی' اس کا شیر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ بہت متاثر کن لگ رہے تھے۔ اس نے اوپری دھڑ پر زعفرانی کپڑا لپیٹا ہوا تھا جبکہ نچلا دھڑ شیر کی کھال سے ڈھانپا ہوا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں ترشول پکڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے لمبے سیاہ بال کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔ جب وہ دریائے گنگا کی طرف جا رہی تھی تو اس کے پیچھے اس کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ شیر ادھر ادھر دیکھے بغیر یا رفتار کم کیے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دریا کے کنارے پر پہنچ کر تانتری عورت نے اپنا ترشول زمین میں گاڑ دیا' جو اس بات کی علامت تھا کہ یہ علاقہ اب اس کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ اس نے زعفرانی کپڑا اور شیر کی کھال اتار دیئے۔ اس نے بالوں کو اکٹھا کر کے سر کے اوپر جوڑا باندھا۔ وہ الف ننگی کھڑی تھی۔ اس کے جسم کا رنگ پرانے ہاتھی دانت جیسا تھا' چھاتیاں بڑی بڑی تھیں' کولہے بھاری تھے۔ رانوں کے درمیان ایک صاف سیاہ تکون تھی۔ وکٹر نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر تیس کے قریب قریب ہے۔ وہ تھوڑی دیر اپنے جسم کو اپنے ہاتھوں سے رگڑتی رہی۔ پھر اس نے ہاتھ سے پانی کو چھوا اور ہاتھ تیزی سے پیچھے ہٹا لیا اور شیر سے کچھ کہا۔ شیر نے اپنی لمبی دم اوپر کی اور آہستہ آہستہ نیچے کر لی۔ وہ دھیرے دھیرے برف جیسے پانی میں اتر گئی۔ اس نے تھوڑا سا پانی اپنے جسم پر ڈالا' پھر پانی میں ڈبکی لگا دی۔ شیر چھلانگ لگا کر دریا میں

جا کر اس کے ساتھ نہانے لگا۔ جب وہ اس کے بہت قریب آ گیا تو اس نے اس کے منہ پر پانی کے چھپکے مارے۔ وہ تھوڑی دیر دریا میں کھیلتے رہے، یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے پانی میں مزید ٹھہرنے سے قاصر ہو گئی۔ اس کے پاس تولیہ نہیں تھا۔ وہ دھوپ میں جسم سکھانے لگی۔ وہ ایک چٹان پر بیٹھ کر اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔ اس نے دوبارہ بال اکٹھے کر کے سر پر جوڑا باندھ لیا۔ شیر اس کے جسم پر موجود پانی کے قطروں کو زبان سے چاٹنے لگا۔

وہ تھوڑی دیر دھوپ میں بیٹھے رہے۔ پھر اس نے دوبارہ زعفرانی کپڑا لپیٹ لیا اور شیر کی کھال باندھ لی۔ اس نے ترشول کو زمین سے اکھاڑا اور آشرم کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ مدر انڈیا کی تصویر کے عین مطابق لگ رہی تھی۔ وہ تصویر وکٹر نے پان والوں کی دکانوں پر دیکھی تھی۔ اچانک اس نے اوپر دیکھا۔ اسے بالکونی میں کھڑا وکٹر دکھائی دیا۔ اس کے چہرے پر غصہ نمایاں ہو گیا۔ اس نے نظریں پھیر لیں اور تیزی سے چلنے لگی۔

وکٹر تھکا تھکا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مدتوں بعد کسی عورت کو ننگا دیکھا تھا۔ وہ بہت مصروف رہا تھا اور جنسی عمل نہ کرنے سے اسے حقیقتاً کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ چنانچہ جب اس نے ننگی عورت کو نہاتے دیکھا تو اس پر اس نظارے کا بہت زبردست اثر پڑا، جس کے لیے وہ قطعاً تیار نہیں تھا۔ جب اس نے اسے اپنے نہاں اعضا کو دھوتے دیکھا تھا تو اس پر ایک زبردست خواہش حاوی ہو گئی تھی۔ وہ وحشیانہ شہوت تھی، جو ادھیڑ عمر والوں کو کبھی کبھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس نے اسے بکھیر کر رکھ دیا۔ وہ اب بھی کپکپا رہا تھا۔ اس نے اس کیفیت سے نجات پانے کے لیے ایک بستی جا کر اپنی ایک شوگر مل کا اچانک معائنہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مصروفیت میں دن کا کافی حصہ گزر جاتا۔

اس شام جب وہ سکاچ کا دوسرا جام پی رہا تھا' اس کے سیکرٹری نے آ کر بتایا: ''سر ماں درگیشوری آپ سے ملنے آئی ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ نے ملاقات کا وقت نہیں لیا ہوا ہے لیکن ان کا اصرار ہے کہ انہیں آپ سے ایک بہت اہم بات کرنی ہے اور وہ چند منٹ سے زیادہ وقت نہیں لیں گی۔''

''کون ہے وہ؟'' وکٹر نے پوچھا۔ حالانکہ وہ پوری طرح جانتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس کی آمد کا مقصد کیا ہے۔

''وہ سادھوی ہے' جو ساتھ والا آشرم چلاتی ہے۔ اس کے پاس ایک شیر بھی ہے۔''

''کیا وہ شیر کو اپنے ساتھ لائی ہے؟''

''نہیں' سر۔ وہ اکیلی ہے۔''

''ٹھیک ہے' اسے آنے دو۔''

وکٹر اپنی بے عزتی کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن اس نے جس طرح اس کو مخاطب کیا اسے اس کی توقع نہیں تھی۔ اس نے اسے اندر آتے اور دروازہ بند کرتے سنا۔ پھر وہ تعارف کرائے بغیر بولی: ''گنگا مائی کے کنارے بیٹھ کر وسکی پیتا ہے۔''

وکٹر اسے سلام کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی: ''بھول ہوئی' معاف کیجئے۔''

''اور تم اپنے بڑے سارے بنگلے کی چھت سے لڑکیوں کو ننگا نہاتے دیکھتے ہو' ہیں؟ شرم نہیں آتی؟''

وکٹر نے دوبارہ معافی مانگی اور کہا: ''ایسا دوبارہ نہیں ہوگا۔''

اس کو امید تھی کہ اس کے بعد ان کی ملاقات ختم ہو جائے گی اور وہ دوبارہ مے نوشی کر سکے گا۔ تاہم ماں درگیشوری دوسرے خیال رکھتی تھی۔ اس نے اپنا ترشول

دیوار سے ٹکا دیا اور اس کی کرسی کے سامنے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس کی موٹی موٹی رانیں ننگی ہو گئیں۔ وکٹر نے نظریں پھیرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس کا منہ شہوت سے خشک ہوا جا رہا تھا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم ہندوستان کے امیر ترین آدمی ہو اور تمھیں اپنی دولت پر بڑا اہنکار (غرور) ہے۔''

''ہاں ماں جی' بھگوان مجھ پر بہت مہربان ہے۔ لیکن میں مغرور نہیں ہوں۔''

''تم بھگوان کی مہربانی کی بات کرتے ہو؟ مجھے تو بتایا گیا ہے کہ تم بھگوان کو نہیں مانتے' مندروں میں نہیں جاتے' پوجا نہیں کرتے۔ تم اپنے انجام کا نہیں سوچتے۔ تم گھمنڈی ہو۔''

وکٹر نے اس سے اختلاف نہیں کیا کیونکہ اس کی ساری باتیں سچ تھیں۔ اس نے بھی جارحانہ پن اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''ماں جی! کیا آپ صرف مجھے ڈانٹنے اور میری اوقات یاد دلانے کے لیے آئی ہیں؟''

''نہیں ــــ مجھے اور بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ اگرچہ تم مجھ سے بہت بڑے ہو' لیکن تم شاستر اور دوسری مقدس کتابیں نہیں پڑھ سکتے۔ تم نے ساری تعلیم مادہ پرست مغرب میں حاصل کی ہے' جہاں پیسے کے سوا کسی شے کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ یہ سب مایا جال ہے۔ تمھیں اس مایا جال سے لازماً نجات پانی چاہیے۔ کیا تم یوگا کرتے ہو؟ کیا تم مراقبہ کرتے ہو؟ اگر تم یوگا کرو گے تو زندگی کی سچائی کے قریب تر پہنچ جاؤ گے۔''

''ماں جی! میں یوگا سیکھنے کے لیے تیار ہوں۔ پلیز مجھے اپنا چیلا بنا لیجیے۔''

''اب تمھیں عقل آ رہی ہے۔ میں بتا سکتی ہو کہ تم بیمار ہو۔ میں تمھارا علاج

کر سکتی ہوں۔ لیکن اگر تم میرے بھگت بننا چاہتے ہو تو تمہیں میرے چرن چھونے ہوں گے اور میری آشیرواد لینا ہوگی" اس نے اپنے پاؤں زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

وکٹر صورتحال سے لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ اس نے گھٹنوں کے بل جھک کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ اس کی نگاہیں بھٹک کر اس کی رانوں کی طرف چلی گئیں اور اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ ماں درگیشوری نے دونوں ہاتھوں سے اس کا سر تھام کر اپنی چھاتیوں کی طرف کھینچا۔ اس نے چھاتیوں کو عریاں کر دیا اور بولی: "لو اب اپنی ماں کی چھاتی سے دودھ پیو۔"

وکٹر نے ایک نرم نرم چھاتی کو پکڑا اور اسے اپنے منہ میں لے کر کسی بھوکے بچے کی طرح چوسنے لگا۔ اس کے بعد اس نے دوسری چھاتی کا رخ کیا اور پھر پہلی کی طرف اور اس کا دودھ پینے لگا۔ ماں درگیشوری نے جھک کر اس کی بیلٹ کھول دی اور اپنے پیروں کے پنجے سے اس کا ٹراؤزر اتارنے لگی۔ وہ اس کے خصیوں اور عضوتناسل کو چھیڑنے لگی۔ "تمہیں تناؤ سے نجات کی ضرورت ہے" اس نے کہا۔ پھر وہ اپنی شیر کی کھال اتار کر صوفے پر لیٹ گئی اور حکم دیا: "آؤ میرے اندر آ جاؤ لیکن زیادہ حرکت مت کرنا۔"

وکٹر نے دخول کیا اور اس کے اوپر ساکت لیٹ گیا۔ اس کی زبان اس کے منہ کے اندر گھوم رہی تھی۔ وہ تو بے حرکت رہی لیکن اپنی اندام نہانی کو بھینچ کر اسے دوہنے لگی۔ وکٹر نے کسی عورت کے ساتھ ایسی سنسنی کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ جب وہ خلاص ہوا تو اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اس نے حلق سے نکلنے والی آواز کو روکنے کے لیے اس کے کندھوں کو دانتوں سے زور سے دبایا۔ وہ لاش کی طرح اس پر پڑ گیا۔ ماں درگیشوری نے اس کے چہرے کو سہلایا اور اس کے بالوں سے کھیلنے لگی۔

"تم بہت جلدی ختم ہو گئے! میرے اندر اب بھی آگ بھڑک رہی ہے۔

میں تمہیں یوگا سکھاؤں گی۔ تم اپنے مادۂ منویہ کو ایک گھنٹے یا اس سے بھی زیادہ دیر تک روکے رکھنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اگر تم اسے کو خارج نہ کرنا چاہو تو تم اسے اپنے اندر واپس بھی لے جا سکو گے۔"

وکٹر نے سر اٹھایا اور اسے بڑے حیران حیران انداز میں دیکھنے لگا۔ وہ مسکرا دی۔ "حیران کیوں ہو۔ ایسا ممکن ہے۔ تم جاہل ہو۔ میں تمہاری جہالت کا علاج کرنا چاہتی ہوں۔ جب میں نے تمہیں اپنی جاسوسی کرتے دیکھا تھا تب ہی مجھے علم ہو گیا تھا کہ تم انسان کو دی گئی سب سے بڑی نعمت کو رد کر رہے ہو۔ تم مرد صرف تیز چھک چھک، پھٹ سے واقف ہو۔ جنس کو پوجا کی طرح سمجھ گے تو تمہیں لاکھوں روپے کمانے سے زیادہ آسودگی ملے گی۔"

"ٹھیک، ماں جی!"

"ارے یہ ماں جی اب نہیں چلے گا! تم نے ابھی تو میرے ساتھ جنسی عمل کیا ہے۔ تم جانتے ہو جو مرد اپنی ماؤں کے ساتھ یہ عمل کریں انہیں کیا کہا جاتا ہے؟ مجھے درگیش کہا کرو۔"

"درگیش، جنسی عمل تو تم نے کیا ہے میرے ساتھ۔ اور مجھے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔ میں اتنے سنسنی خیز جنسی عمل سے آشنا ہی نہیں تھا۔ حد تو یہ ہے کہ میں نے چودہ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ کیے گئے جنسی عمل میں بھی ایسی سنسنی محسوس نہیں کی تھی۔"

درگیشوری نے کہا: "فطری سی بات ہے، تم مجھ سے پہلے کبھی ملے ہی نہیں تھے اس لیے تمہیں ایسا تجربہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے تانترا کے فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے کئی برس لگائے ہیں۔ میں تمہیں تمہارے خوابوں سے زیادہ سنسنی خیز چیزیں دکھاؤں گی۔"

وکٹر ہنسنے لگا۔ ''مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔ تاہم میرے ساتھ محتاط رہنا۔ میرا ڈاکٹر کہتا ہے کہ مجھے بہت زیادہ جوش سے بچنا چاہیے۔ میرا دل اسے برداشت نہیں کر سکے گا۔''

''ارے یہ چیر پھاڑ ڈاکٹر — انہیں پتا ہی کیا ہے؟ وہ تمہیں چیر کر دوبارہ سی دیتے ہیں اور وقت سے پہلے موت کے حوالے کر دیتے ہیں۔ میرے ساتھ تم اپنی جوانی دوبارہ پا لو گے۔ سولہ سال کے چھوکرے کا دل ہو گا تیرا۔''

وکٹر کو اس کے کہے ہوئے ایک ایک لفظ پر یقین تھا۔ اس نے اس کے ذہن سے ہر شبہے کو دور کر دیا تھا۔ جنس موت کے خوف کا بہترین علاج ہے۔

''کیا تم کل ملنے آؤ گی؟'' اس نے پوچھا۔

''تم جب چاہو گے میں ملنے آ جایا کروں گی۔''

''یاد رکھنا میں تمہارا بھگت بن چکا ہوں۔ تم مجھے بھلا نہیں سکتی ہو'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا: ''لیکن اپنے شیر کو مت لانا۔''

''شیرو بہت حاسد ہو سکتا ہے۔ اگر وہ تمہیں مجھے کھاتے دیکھے گا تو تمہیں کھا جائے گا۔'' وہ ہنسنے لگی۔

وکٹر نے اسے بانہوں میں لے کر اس کے جسم کے وسطی حصے کو دبایا اور ہاتھ اس کے کولہوں پر پھیرنے لگا' یہاں تک کہ وہ دوبارہ جنسی عمل کے لیے تیار ہو گیا۔ ''بس کافی ہے!'' درگیشوری بولی۔ ''کچھ کل کے لیے بھی چھوڑ دو۔''

اس نے وکٹر کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

''کل اسی وقت۔ میں تمہیں لینے کے لیے کار بھجوا دوں گا۔''

اگلے دن صبح سویرے وکٹر بالکونی میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ ماں درگیشوری اور شیرو جلد ہی نمودار ہوئے اور پہاڑی سے اتر کر اس جگہ کی طرف چلے گئے جہاں

وہ گزشتہ روز نہائے تھے۔ درگیشوری نے پہلے والی جگہ پر ترشول گاڑ دیا اور مخصوص لباس اتار دیا۔ اس منظر کو دیکھ کر وکٹر کا سانس ایک بار پھر رک سا گیا۔

درگیشوری سے پہلے وکٹر نے اپنی بیوی کے علاوہ چند عورتوں کے ساتھ جنسی عمل کیا تھا' جن میں سے بیشتر طوائفیں تھیں۔ وہ ہمیشہ جلدی میں ہوتا تھا اور جنسی عمل سے پہلے ان کے جسموں سے لطف اندوز نہیں ہوا کرتا تھا۔ درگیشوری کے ساتھ بھی گزشتہ روز کے جنسی عمل میں ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے مشکل ہی سے دیکھا تھا کہ وہ کتنی کامل ہے۔ اس صبح تک اسے علم نہیں تھا کہ کسی عورت کے کولہے کتنے شہوت انگیز ہوتے ہیں۔ بیشتر سفید فام عورتوں کے کولہے مردوں جیسے ہوتے ہیں' جو صرف بیٹھنے کے وقت دو گدیوں جیسا کام دیتے ہیں۔ وہ وکٹر میں گرمی پیدا نہیں کرتے تھے۔ اس کی بیوی کے کولہے بھی قابل ذکر نہیں تھے۔ اس کے برعکس اس نوجوان سادھوی کے کولہے نہایت سرور دینے والے تھے۔ وہ بڑے بڑے اور گول تھے۔ اگر اسے موقع ملتا تو وہ گھنٹوں ان پر نرمی سے ہاتھ پھیرتا رہتا۔ اس کی سمجھ سے باہر تھا کہ اس کے آباؤ اجداد نے عورت کے کولہوں کو ہتنی ۔۔۔ ہتنی ۔۔۔ کے پچھلے حصے سے کیوں تشبیہہ دی تھی۔ کون ہے جو کسی ہتنی کے عقبی حصے پر ضرب لگانا چاہتا ہو؟ لیکن ادھر تو ایک اپسرا تھی' جو پوتر گنگا کے پانیوں سے ابھر رہی تھی' اس کے ہاتھ پہاڑیوں کے اوپر طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طرف سلامی کے لیے اٹھے ہوئے تھے اور وہ اس کے کولہے دیکھ کر حیران تھا اور ان کی پوجا کر رہا تھا۔

درگیشوری نے محسوس کر لیا کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔ اس نے اوپر دیکھا تو اسے اپنی توقع کے مطابق بالکونی میں وکٹر کھڑا دکھائی دیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اوپر کر کے ہتھیلیاں جوڑ لیں' جیسے کہ نمستے کہتے وقت جوڑی جاتی ہیں۔ ایسا کر کے اس نے اپنی دکھانے والی ہر شے عیاں کر دی تھی۔ وکٹر نے جوش کے ساتھ ہاتھ لہرا کر

جواب دیا۔ اس نے سوچا کہ یہ حسن کا کیسا نظارہ ہے! وہ سمندر کے پانی سے نکلتی ہوئی ایفرو ڈائٹی جیسی لگ رہی تھی۔ اس نے اس سے پہلے اتنی خوبصورت اور آزاد خیال عورت کوئی نہیں دیکھی تھی۔ نہ ہی کوئی اتنی سحرانگیز عورت دیکھی تھی۔ وہ اسے نہاتے' اپنے شیر کے ساتھ کھیلتے اور دھوپ میں بدن سکھاتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اپنا لباس پہنا۔ اس دوران اس نے اپنا رخ اسی کی طرف رکھا تھا۔ پھر وہ پہاڑی راستے پر چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وکٹر نے اپنے سیکرٹری کو بلایا: ''آشرم جا کر دیکھو کہ وہ کیسا ہے۔ پتا کرو کہ کیا اسے خیراتی ادارے کی حیثیت سے رجسٹرڈ کروایا گیا ہے کہ نہیں اور اس کا بینک اکاؤنٹ نمبر کیا ہے۔ کار لے جاؤ۔''

سیکرٹری نے دو گھنٹے بعد آ کر اطلاع دی: ''سر! بڑی خستہ حال عمارت ہے۔ اس میں صرف دفتر' ایک درگا مندر اور ایک مراقبہ ہال ہے' جو پکا ہے۔ باقی احاطے میں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں اور تین بھینسوں کا باڑہ ہے۔ سبزیوں کے کھیت کو پانی دینے کے لیے ایک ٹیوب ویل ہے۔ وہاں تین افراد رہتے ہیں' جن میں ایک سوامی جی بھی ہے۔ وہ ان کا یوگا کا استاد ہے۔ ایک انگریز عورت نے' جو کہ اس تماشے کی منتظم لگتی تھی' مجھے بتایا کہ یہ ایک خیراتی ادارے کے طور پر رجسٹرڈ ہے اور رشی کیش کے ایک بینک میں ان کا اکاؤنٹ ہے۔ ان کی مالی حالت پتلی ہے' سر! حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں اپنے تمام چوکیدار کتے بیچنے پڑ گئے تھے کیونکہ انہیں رکھنا مہنگا پڑتا تھا۔''

وکٹر نے آشرم کے نام ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کا چیک لکھا اور لفافے میں بند کر دیا۔ لفافے میں اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا بھی رکھا تھا' جس پر ہندی میں لکھا تھا: ''آپ کے تازہ ترین بھگت کی طرف سے گرو دکشنا'' اس نے سیکرٹری سے

کہا کہ وہ اسے ماں درگیشوری کو دے آئے۔

اس شام وکٹر نے شیونگ اور نہانے میں بڑی دیر لگا دی۔ وہ خوب رگڑ رگڑ کر نہایا۔ پھر سارے بدن پر یوڈی کلون چھڑکا۔ اس نے دانتوں کو صاف کیا' زبان کو رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور خصوصی طور پر درآمد کیے گئے ماؤتھ واش سے غرارے کیے۔ اس نے اپنی سب سے اچھی ریشمی شرٹ اور نیا ٹراؤزر پہنا۔ اسے نوجوان اور پورا ہونا اچھا محسوس ہوا۔ اس نے سکاچ کی بوتل' سوڈا اور برف صوفے کے ساتھ رکھ دی۔ اس نے سکاچ کا ایک بڑا جام بنایا اور بیتابی سے کار کی آواز سنائی دینے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ دوسرا جام پی رہا تھا کہ اسے کار کے پورچ میں رکنے کی آواز سنائی دی۔ وہ ملاقاتی کے خیرمقدم کے لیے تیزی سے باہر نکلا۔ جونہی وہ ترشول تھامے کار سے باہر آئی' وکٹر نے جھک کر اس کے پاؤں چھوئے۔ یہ عمل اس نے اپنے سیکرٹری اور شوفر کو دکھانے کے لیے کیا تھا۔ وہ اسے سیڑھیوں سے اوپر لے گیا۔ دروازے کی کنڈی لگا کر اس نے درگیش کو بانہوں میں لے لیا۔

''پاکھنڈی'' اس نے کہا۔ ''تم نے اپنے سٹاف کو ...... بنا دیا۔ ابھی تم میرے پاؤں چھو رہے تھے جیسے میں کوئی دیوی ہوں اور اب تم مجھے یوں شہوت بھرے انداز میں بانہوں میں لیے ہوئے ہو جیسے میں تمہاری رکھیل ہوں!''

وکٹر نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ بلاشبہ وہ اس کی دیوی' اس کی استانی تھی۔ وہ اس سے جو چاہتی کروا سکتی تھی۔ اس نے اس کا ترشول ایک طرف رکھ دیا اور اسے کھینچ کر اپنے نزدیک کر لیا۔

''میں ساری رات اور دن بھر تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔ میں پہلے جس سے بھی ملا اس کے لیے کبھی ایسا محسوس نہیں کیا۔''

''جھوٹا'' درگیشوری بولی۔ ''ایسے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم نے ولایت میں کتنی گوری چٹی عورتوں کے ساتھ ہمبستری کی ہے یا ہندوستان میں کتنی عورتوں کے ساتھ سو چکے ہو۔''

''تم ان سب سے زیادہ خوبصورت ہو۔ اور ہاں مجھے ڈانٹنا چھوڑ دو۔ شام زیادہ بہتر کاموں کے لیے ہے۔'' اس نے درگیش کو نرمی سے صوفے پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ میرے ہونٹ بند کرنے سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے جو اتنی بڑی رقم بھیجی ہے وہ گزشتہ رات کا معاوضہ ہے یا آشرم کے لیے ہے؟''

''اوہ شٹ اپ'' وکٹر نے بے صبری سے کہا۔ ''تمہیں ایسی فضول باتوں سے روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔''

اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے چپکا دیئے اور اس کی چھاتیوں سے کپڑا ہٹانے لگا۔ اس نے اس کام میں وکٹر کی مدد کی۔ جونہی اس کی چھاتیاں ننگی ہوئیں' وہ انہیں چوسنے لگا۔ اس کی زبان کے لمس سے اس کی بھٹنیاں سخت ہو گئیں۔ جب اسے سرور زیادہ آنے لگا تو اس کا سر پیچھے ڈھلک گیا۔ درگیشوری نے اسے کپڑے اتارنے میں مدد دی' پھر اپنی شیر کی کھال اتار کر بولی: ''پچھلی رات آدھا مزا میں نے خود لیا تھا' آج باقی آدھا تم دینا۔''

یہ دونوں کے لیے ایک مختلف تجربہ تھا۔ وکٹر نے ہاتھوں سے اس کے پیروں سے لے کر سر تک اس کا جسم سہلایا۔ اس نے اس کی رانوں کی اندرونی سمت زبان پھیری' اس کی چھاتیوں' ہونٹوں اور گردن پر دانت کاٹے۔ جواب میں اس نے ناخن اس کے کولہوں میں کھبا دیئے۔ جب اس نے دخول کیا تو درگیشوری نے کہا کہ وہ زیادہ شدت سے کام لے۔ پہلے کی طرح اس نے اندام نہانی بھینچ بھینچ کر اسے شدت کے ساتھ دوہا۔ وہ سنسنی کا عادی ہو گیا تھا۔ یہ عمل بہت خوشگوار تھا اور وہ خود پر

قابو رکھنے میں کامیاب تھا۔ آخر درگیشوری جنگ ہار گئی۔ اس نے اپنے کولہے بے انتہا قوت سے اوپر کیے اور کراہنا اور چیخنا شروع ہو گئی: ہائے مر گئی! قتل کر دو!" وکٹر بازوؤں اور پنجوں کے بل اٹھا اور جو کچھ رکھتا تھا' سارا اسے دے دیا۔ آخر اس نے اپنی ٹانگیں اس کے اوپر ہوا میں اٹھا کر انہیں جھٹکنا شروع کر دیا۔ صوفہ ہلنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو۔

یہ عمل ایک گھنٹہ جاری رہا۔ دونوں مکمل طور پر تھک گئے تھے۔ وکٹر نے اس کا جسم اپنے نیچے سے آزاد کر دیا۔ اس نے درگیشوری کے گال کو نرمی سے چوما اور بولا: "درگیش مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

درگیش نے اس کا سکول کے لڑکوں جیسا اعتراف نظر انداز کر دیا اور بولی: "دیکھو تو تم نے میرا کیا حال کر دیا ہے! میرے سارے جسم پر ناخنوں اور دانتوں سے کاٹنے کے نشان پڑے ہوئے ہیں۔ میں آشرم میں لوگوں کا سامنا کس طرح کروں گی؟ وہ سوچیں گے کہ ضرور شیرو نے مجھ پر حملہ کر دیا ہو گا۔ تم انسان ہو یا شیر؟"

"میں ایک شیر نما انسان ہوں اور تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

"تم تو آدھے پاگل بھی ہو۔ ایک تو یہ کہ تم برہمن ہو اور میں کشتریہ ہوں۔ ہم سمبندھ تو رکھ سکتے ہیں لیکن میاں بیوی نہیں بن سکتے۔ دوسرے یہ کہ تم مجھ سے تقریباً 25 سال بڑے ہو۔ اور سب سے اہم یہ کہ میں آشرم میں انگریزی میں گٹ پٹ کرنے والی میم صاحب نہیں بن سکتی۔ پس شادی کو ذہن سے نکال دو۔ تم جب اور جہاں چاہو گے میں تمہیں ملنے آ جاؤں گی۔"

انہوں نے زیادہ تر روبرو گفتگو نہیں کی۔ درگیشوری نے اپنا سر اس کے

کندھے پر رکھ دیا۔ وکٹر اس کی چھاتیوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس نے باری باری انہیں چوما۔ درگیشوری نے اس کے خصیوں کو بھینچا اور عضوتناسل کو دباتی رہی۔ یوں ان میں مستقبل کی باتیں ہوئی تھیں۔ وکٹر نے تہیہ کر لیا تھا کہ اسے جانے نہیں دے گا۔ درگیشوری نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ جب تک اس سے نبرد آزما ہو سکتا ہے' وہ اس کے ساتھ رہے گی۔

''کیا تم کوئی ورزش کرتے ہو؟ کیا تم یوگا کا کوئی آسن جانتے ہو؟'' اس نے وکٹر کی توند میں انگلیاں چبھوتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری توند نکل آئی ہے۔ میں صبح کے وقت اپنے سوامی جی کو تمہاری طرف بھیجوں گی۔ وہ تمہیں کچھ آسن سکھائے گا۔ وہ تمہیں درست طریقے سے سانس لینا سکھائے گا۔ وہ تمہیں یہ بھی سکھائے گا کہ تم اپنے بندو کو کس طرح قابو کر سکتے ہو۔ اس سے تمہاری جوانی لوٹ آئے گی۔ میں اپنے محبوب کو وقت سے پہلے بوڑھا ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔ جنسی عمل کے بہت سے مختلف انداز ہیں' جو میں تمہیں سکھانا چاہتی ہوں۔ ان کے لیے تمہیں کافی مستعد ہونا چاہیے۔''

☆☆☆

سوامی دھنن جے مہاراج برہمچاری اگلی صبح پہنچ گیا۔ وہ بھی ایک حیرت انگیز شخص نکلا۔ وہ چھ فٹ سے زیادہ لمبا تھا۔ اس کے جسم پر ایک اونس بھی فالتو گوشت نہیں تھا۔ وہ کسی اٹینشن کھڑے سپاہی کی طرح سیدھا تنا ہوا کھڑا تھا۔ اس کے سیاہ بال اس کے شانوں تک لمبے تھے۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی بھی صاف صاف ترشی ہوئی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا — وہ 35 یا شاید 45 کا ہو سکتا تھا۔ اس نے ململ کے باریک کپڑے سے اپنا سارا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ کپڑا اتنا باریک تھا کہ اس کے آر پار دیکھا جا سکتا تھا۔

''ماں جی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ یوگا کے آسن سیکھنا چاہتے ہیں'' وہ مسکرائے بغیر بولا۔

''ہاں سوامی جی! ماں درگیشوری کہتی ہے کہ میری توند نکل آئی ہے'' وکٹر نے اپنے پیٹ کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''ہو سکتا ہے یوگا میرے نظام کو درست کر دے گا۔''

''چلیں دیکھتے ہیں۔ فرش پر لیٹ جائیں۔''

وکٹر فرش پر لیٹ گیا۔ سوامی جی نے سفید ململ کی کسی تہہ سے ایک ناپنے والی ٹیپ نکالی۔ اس نے وکٹر کی دائیں چھاتی سے لے کر دائیں پیر کے پنجے تک ناپا۔ اس نے بائیں چھاتی سے لے کر بائیں پاؤں کے پنجے تک بھی ایسا ہی کیا۔

''دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کیا آپ کو گیس کی شکایت ہے؟''

وکٹر کو جھٹکا سا لگا۔ کیا کسی اجنبی سے اس طرح کے سوال پوچھے جاتے ہیں؟ کیا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ پاد بہت زیادہ مارتا ہے؟

''تھوڑی بہت تیزابیت رہتی ہے'' اس نے غیر یقینی پن سے جواب دیا۔ ''سہ پہر کے وقت میرے معدے میں تھوڑی ہوا محسوس ہوتی ہے۔ تاہم جب میں ایک دو جام وسکی پی لیتا ہوں تو ٹھیک ہو جاتا ہوں۔''

''معدے میں گیس کا ہونا آپ کے لیے برا ہے۔ میں آپ کو کچھ آسن سکھاؤں گا' جو وسکی پیے بغیر گیس سے نجات پانے میں آپ کی مدد کریں گے۔ میں آپ کو سانس لینے اور باہر نکالنے کا بھی صحیح طریقہ سکھاؤں گا۔ آپ کب آغاز کرنا پسند کریں گے؟ بہترین وقت صبح کا ہوتا ہے' جس وقت آپ اپنی آنتیں خالی کر چکے ہوتے ہیں۔ یوگا خالی معدے بہترین ہوتا ہے۔ اور آپ درست انداز میں بیٹھنا سیکھیں'' سوامی جی فرش پر بیٹھ گیا اور کنول کے آسن میں آلتی پالتی مار لی۔ ''یا اس

طرح'' وہ درزیوں اور جاپانیوں کی طرح بیٹھتے ہوئے بولا: ''ریڑھ کی ہڈی کو سیدھا رکھئے' اسے مڑا ہوانہیں ہونا چاہیے۔''

وکٹر نے کوشش کی لیکن گھٹنے صحیح طرح جھکا نہیں سکا۔ سوامی جی نے کہا: ''جلدی مت کریں۔ ہر صبح کو کوشش کریں گے تو آپ ایسا کرنے کے اہل ہو جائیں گے۔''اس نے دوسرے آسنوں کا مظاہرہ کر کے دکھایا مثلاً سر پر کھڑا ہونا — شرش آسن — کمان کی طرح جسم کو جھکانا — دھنورا آسن۔ وکٹر سحرزدہ انداز میں اسے دیکھتا رہا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سوامی جی کا جسم ربر کا بنا ہوا ہے۔

''درست طریقے سے سانس لینا نہایت اہم ہے'' وہ کنول کے آسن میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے اپنی انگلی سے ایک نتھنا بند کر لیا اور دوسرے سے گہرا سانس لیا' پھر زوردار آواز کے ساتھ سانس خارج کر دیا۔ اس نے دوسرے نتھنے سے بھی سانس لیا اور خارج کیا۔

''لیکن ہم آپ کے خاص مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ آپ نے بتایا ہے کہ آپ کو گیس کی تکلیف ہے۔ شہر کے رہنے والے' جو کہ بیشتر وقت کرسیوں پر بیٹھ کر گزارتے ہیں' اسی مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں۔ میں آپ کو پیٹ کے عضلات کی ورزش اور گیس خارج کرنا سکھاؤں گا۔''

اس نے اپنے عضلات کو اس طرح ہلایا کہ اس کی چھاتی سے لے کر کولہوں تک لہریں سی پڑ گئیں۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کے سہارے جسم اوپر کیا اور زوردار پاد مارا۔ وکٹر کو بہت ہنسی آئی لیکن اسے اپنی ہنسی پر ضبط کرنا پڑا۔ سوامی جی نے اس کی کیفیت کو بھانپ لیا۔ وہ بولا: ''گیس کوئی مذاق نہیں ہوتی۔ پلیز دھیان دیجئے' میری گیس میں بو نہیں ہے — یہ اتم پادوی ہے' اعلیٰ ترین درجے کا پاد۔''

وکٹر اس طرح کا مظاہرہ مزید نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ تاہم اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے سوامی جی کمر کے بل لیٹ چکا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں اٹھائیں یہاں تک کے اس کے گھٹنے اس کی گردن کے قریب پہنچ گئے۔

''پون مکت آسن'' وہ بولا ''یہ گیس نکالنے کے لیے ہوتا ہے۔''

اس مرتبہ وہ آہستہ آہستہ دیر تک پاد مارتا رہا۔

''پلیز پھر دھیان دیں'' سوامی بولا۔ ''کوئی بو نہیں ہے۔''

وکٹر بے مزہ ہو گیا۔ یہ تو پاد مارنے کا طویل مظاہرہ تھا۔ تاہم سوامی جی نے دوسرے آسنوں کا مظاہرہ کر کے اسے حیران کر دیا۔ اس نے ریڑھ کی ہڈی، گردن، آنکھوں اور پھیپھڑوں کے لیے آسن دکھائے۔

سبق ایک گھنٹے بعد ختم ہو گیا اور سوامی جی کو کار پر آشرم واپس پہنچا دیا گیا۔ وکٹر نے کچھ آسنوں اور سانس لینے کی مشقوں کو دہرانے کی کوشش کی۔ اس نے بے شرمی سے گیس خارج کی اور اپنی صحت کو بہتر ہوتا محسوس کیا۔ جب درگیش شام کو آئی تو اس نے نئی قوت کے ساتھ اس سے جنسی عمل کیا۔

☆☆☆

وکٹر نے صرف دو دن ہالیڈے ہوم میں ٹھہرنے کا سوچا تھا۔ اب سے چوتھا دن ہو چکا تھا اور وہ جتنا ممکن ہو اپنی تعطیلات کو طویل کرنا چاہتا تھا۔ وہ موت کے خوف پر قابو پا چکا تھا۔ جب سے اس کی نظریں گنگا میں نہاتی درگیشوری پر پڑی تھیں تب سے اس نے اپنی صحت اور ممکنہ موت کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ زندگی کے دو نہایت اہم پہلوؤں کو نظرانداز کر چکا تھا: ''اچھی صحت اور اچھی جنس۔'' ترمیم کرنے میں بہت دیر نہیں ہوئی تھی۔ طویل عرصے بعد اسے دو افراد مل گئے تھے، جو اسے اچھی صحت اور اچھی جنس کی ضمانت دے سکتے تھے۔ وہ ان دونوں کو ساتھ

رکھنے کا تہیہ کر چکا تھا۔

اگلی شام جب وہ محبت کر چکے تو اس نے یہ معاملہ درگیشوری کے سامنے رکھا (اس مرتبہ ماں درگیشوری نے اصرار کیا تھا کہ جنسی عمل کھڑے ہو کر کیا جائے۔ اس عمل نے دونوں کو بری طرح تھکا دیا تھا)۔

''درگیش مجھے اپنے کاروبار اور خاندان کی طرف لازماً واپس جانا ہے۔ لیکن اب تم میرے لیے دنیا کی ہر شے سے زیادہ اہم ہو چکی ہو۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔''

''تم کو مجھے کھونے کا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ تم جہاں کہیں چاہو گے میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ لیکن میرا آشرم ہے' مجھ پر انحصار کرنے والے اس میں رہنے والے لوگ ہیں اور میرا شیرو ہے' جو کہ آشرم کو اپنا علاقہ سمجھتا ہے اور جب اسے اس کے علاقے سے باہر لے جایا جائے تو ناراض ہو جاتا ہے' خواہ میں اس کے ساتھ ہوں۔ تم یہاں آ سکتے ہو۔ اگر تم میرے لیے کار بھجوا دو تو میں دہلی آ سکتی ہوں۔ میں کبھی بمبئی نہیں گئی۔ میں نے سمندر نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے تم مجھے بمبئی اور سمندر دونوں دکھاؤ گے۔''

''ضرور' ضرور۔ تم اپنے آشرم کی فکر مت کرو۔ جب بھی تمہیں پیسے کی ضرورت ہو' میں گرو دکشنا دے دوں گا۔ تم نے مجھے زندگی کے بارے میں کسی بھی گرو سے زیادہ سکھایا ہے۔ میں تمہارا اور تمہارے شیرو کا بہت خیال رکھوں گا۔ میں سوامی جی کو بھی اپنا ملازم رکھ لوں گا۔ کیا تم میری ماں اور بیٹی سے ملنے کے واسطے چند دنوں کے لیے دہلی نہیں آ سکتی ہو؟ سوامی جی کو اپنے ساتھ لانا' اس طرح لوگ زیادہ باتیں نہیں بنائیں گے۔ وہ بھارتی کو یوگا سکھا سکتا ہے۔ وہ کوئی ورزش نہیں کرتی اور بہت غصہ ور ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟''

"ہاں، لیکن تم مجھے اپنی بیوی بنانے کی کوشش مت کرنا۔" اس نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اب سے تم ہمارے ان داتا ہو۔ تم ہمیں دہلی چلنے کا کہو گے، ہم دہلی چلیں گے۔ تم کہو گے بمبئی چلو، ہم بمبئی چلے جائیں گے۔ لیکن تمہیں اور مجھے دونوں کو آزاد رہنا چاہیے۔"

وکٹر نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ دونوں آزاد ہی رہیں گے۔

گیارہواں باب

پہاڑوں سے اترتے دریائے گنگا' ترشول تھامے' شیرو کو پیچھے لگائے ہوئے ماں درگیشوری اور سوامی دھنن جے مہاراج نے یورپ زدہ وکٹر کی دنیا ہی بدل دی۔ اسے اپنے ملک کے بارے میں ساری معلومات صرف اپنے انگریزیت زدہ باپ سے حاصل ہوئی تھیں۔ اسے گاندھی سے حب الوطنی ملی تھی۔ پوتر دریا' تانتری عورت اور سوامی ایک ایسا ہندوستان تھے' جس سے وہ آگاہ نہیں تھا۔ یہ ہندوستان اس کی زندگی میں اس وقت تبدیلی لایا جب زندگی اسے بیزار کرنے لگی تھی۔ تانتری سادھوی کے گرمجوش ردعمل نے اسے مطمئن کر دیا تھا۔ وہ دس دن بعد نئی قوت سے لبریز ہو کر دہلی واپس پہنچا۔ دو دن بعد اس نے ماں درگیشوری' شیرو اور سوامی جی کو لانے کے لیے ایک بڑی سٹیشن ویگن بھیجی۔

اس کی بیٹی لندن سے واپس آ چکی تھی۔ وہ طویل عرصے بعد نہایت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ وکٹر کی ماں یہ سن کر خوش ہوئی کہ اس نے گنگا مائی کے حضور عقیدت کا نذرانہ پیش کیا تھا' ایک سادھوی کا بھگت بن گیا تھا اور یوگا کر رہا تھا۔ صرف اس کی بہن اور اس کا شوہر اس کے بقول حقیقی ہندوستان کے لیے اس کے تازہ ولولے کے حوالے سے کچھ ناخوش تھے۔ وکٹر نے انہیں نظرانداز کر دیا۔

ویلیری بوٹو ملی کے استعمال میں رہنے والے کاٹیج کو ماں درگیشوری اور شیرو

کے لیے صاف کر دیا گیا۔ بڑے گھر میں ایک کونے والا کمرا سوامی جی کے لیے تیار کیا گیا۔ وہ چائے کے وقت پہنچے۔ ماں درگیشوری وکٹر کی ماں سے گلے ملی، سوامی جی نے اس کے پیر چھوئے۔ وکٹر کے دوست اور گھریلو ملازم مہمانوں کے درشن کرنا چاہتے تھے لیکن شیرو کو دیکھتے ہی سب الٹے پیروں واپس چلے گئے۔ ماں درگیشوری نے انہیں کہلوایا کہ وہ سب آ جائیں، خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر وہ چاہیں تو شیرو کو زنجیر سے باندھا جا سکتا ہے۔ اس نے وکٹر سے کہا کہ چاندی کی زنجیر کا بندوبست کیا جائے۔ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ عقیدت منداس کی آشیرواد لینے واپس آ گئے۔ انہوں نے پوچھا: ''کاٹے گا تو نہیں؟''

''اگر تم اسے تنگ نہیں کرو گے تو یہ کسی پالتو بلی کی طرح کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا۔ تمہیں اس بات کو ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ یہ بھی ایک پوتر ہستی ہے'' ماں درگیشوری نے جواب دیا تھا۔

بھارتی واحد ایسا فرد تھی، جو پہلے دن سے ہی شیر سے خوفزدہ نہیں تھی۔ اس نے شیر کا سر تھپتھپایا۔ شیر نے اس کی ٹانگوں سے جسم کو رگڑا۔ وہ ایک ہی نوع کے جانور لگتے تھے۔ یہ دوسرے دن کی بات ہے کہ وکٹر کی ماں بھی شیرو کے گلے میں بازو حمائل کرنے پر راضی ہو گئی۔ جواب میں شیرو اس کے چہرے کو چاٹنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر سب خوش ہوئے۔

ماں درگیشوری بہت تھوڑا سامان لے کر آئی تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس لائی تھی جس میں اس کے کپڑے تھے ــــ اس کی چھاتیاں ڈھانپنے کے لیے ایک اضافی انگیا، اور ایک زعفرانی لنگی ــــ اس کے علاوہ شیرو کے لیے پیتل کے تین بڑے پیالے تھے: ایک دودھ اور ابلے ہوئے چاولوں کے لیے، دوسرا ابلی ہوئی دالوں اور پھلیوں کے لیے اور تیسرا پانی پینے کے لیے۔ درگیشوری نے اپنی پرانی عادت کے

مطابق فرش پر سونے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے بیڈروم میں شیر کی کھال بچھا لی۔ شیرو کاٹیج میں گھوم پھر کر مختلف جگہیں سونگھتا رہا اور پھر مرکزی کمرے کے صوفے کو سونے کے لیے منتخب کیا۔

وکٹر پہلی شام کاٹیج گیا۔ اس نے درگیش کو بانہوں میں بھر کر بھینچ لیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔ "رشی کیش میں گزرے ہوئے تین دن سورگ کے تین سو سال کے برابر ہیں۔"

"فِلم بوہت دیکھتا ہے" درگیشوری ہنستے ہوئے بولی۔

"میں نے دس برسوں میں کوئی ایک بھی ہندی فلم نہیں دیکھی۔ وہ نہایت غیر حقیقی ہوتی ہیں۔ تمہارے لیے میری محبت حقیقی ہے۔ چلو وقت ضائع نہ کریں۔ ماں رات کے کھانے پر تمہاری آمد کی منتظر ہوگی' وہ رات کا کھانا جلدی کھاتی ہے۔"

"میں صاف نہیں ہوں۔ تمہیں محبت کے لیے ابھی دو دن مزید انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن ہم محبت کی باتیں اور دوسرے محبت بھرے کام کر سکتے ہیں۔"

وکٹر مایوس تو ہوا لیکن صورتحال کو سمجھ گیا۔ پس وہ دوسرے محبت بھرے کام کرنے لگے۔ وہ اسے انتہائی مدہم آواز میں تانترا کے انتہائی ناقابل یقین جنسی اسرار سے آگاہ کرنے لگی۔ اس کی باتیں سن کر وکٹر کا عضو تناسل ایستادہ ہو گیا۔

ایک نوکر نے دروازے پر دستک دے کر انہیں بتایا کہ ماں جی کھانے پر ان کا انتظار کر رہی ہیں۔ کھانے کے لیے جانے سے پہلے درگیشوری نے وکٹر کا عضو تناسل تھام لیا اور وہ لطف لینے کے لیے فوراً خلاص ہو گیا۔

شانتی بھون میں ڈنر ٹیبل تبدیل ہو گئی تھی۔ اب اس پر نہ پلیٹیں تھیں' نہ کانٹے' نہ چاقو اور نہ بلوریں برتن۔ ان کی جگہ چاندی کی تھالیاں اور کٹوریاں رکھی گئی تھیں۔ خوراک ساتوک یعنی خالصتاً سبزی خوروں والی تھی ـــ تازہ تلی ہوئی پوریاں'

آلو کی بھاجی، دال، مختلف سبزیاں، ابلے ہوئے چاول اور آخر میں کھیر۔ سب نے کھانا ہاتھوں سے کھایا۔ وکٹر نے ہاتھوں سے کھانا بہت برے طریقے سے لیکن بڑے جوش کے ساتھ کھایا۔ بھارتی بھی بدلے ہوئے مینیو اور کھانے کے انداز سے بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ سوئس تربیت نے اس کی بچپن کی عادتوں کو تبدیل نہیں کیا تھا۔ اس تبدیلی سے وکٹر کی ماں بہت خوش تھی۔ اس نے شیرو کو بھی کچھ پوریاں ڈالیں۔ وہ انہیں مزے لے لے کر کھا گیا۔ صرف وکٹر کی بہن اور اس کے آئی سی ایس خاوند نے بڑی مشکل سے کھانا کھایا۔

سوامی جی کو یوگا کی کلاسیں لگانے کا کہا گیا ـــ صبح کے وقت گھر میں گھر والوں اور ملازموں کے لیے، شام میں دفتر کے احاطے میں دفتری عملے کے لیے۔ وکٹر نے دونوں کلاسوں میں حاضری دی۔ اس نے دونوں کلاسوں میں اپنی بیٹی کو بھی حاضر ہونے میں پرجوش مدد دی۔ وہ بھی دیکھ سکتی تھی کہ یوگا نے اس کے باپ پر اچھا اثر ڈالا ہے اور وہ چاہتی تھی کہ اس کا باپ اس کے ساتھ یوگا کرے۔ ایک ہفتے کی مشق کے بعد وکٹر کنول کے آسن میں بیٹھنے اور سوامی جی کی مدد سے سر کے بل کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔ بھارتی کم عمر ہونے کی وجہ سے آسان آسن جلدی سیکھ گئی۔ سوامی جی نے اپنے محسن کی نوجوان بیٹی کو خصوصی توجہ دی، وہ اس کا بیٹھنے کا انداز اور اس کی ٹانگوں اور ہاتھوں کے زاویے درست کراتا۔ بعض اوقات وہ کسی لڑکے کی طرح اپنے ہاتھ اس کی ٹانگوں اور کولہوں پر زیادہ دیر تک رکھے رہتا۔ وہ اس دبلی پتلی لیکن سخت دکھائی دینے والی لڑکی کی طرف مائل ہو گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک انوکھا مردانہ پن تھا، جو اس کو غیر معمولی حسن عطا کرتا تھا۔ وہ سوچتا کہ اگر اس کی لمبی لمبی ٹانگیں اس کے گرد لپٹی ہوں گی تو کیسا محسوس ہو گا۔ تاہم وہ درشت انسان نہیں تھا۔ وہ بدنام ہونے اور بے بھگوان کی سرپرستی کھونے کا خطرہ

مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ لڑکی سے ڈرتا بھی تھا۔ اس نے فی الحال ایک اچھا یوگا ٹیچر بننے کا فیصلہ کیا۔

وکٹر اور بھارتی دونوں سوامی جی سے خوش تھے۔ وہ اس امر سے متفق تھے کہ اسے اچھی تنخواہ پر اپنی کمپنیوں کے لیے یوگا انسٹرکٹر رکھ لیا جائے۔ اس حیثیت میں وہ ان کی ملوں اور فیکٹریوں میں باری باری جا کر یوگا کی تربیت دیتا۔ انہوں نے ماں درگیشوری سے بھی مشورہ کیا۔

اچھا تو تم سوامی کو مجھ سے چھیننے لگے ہوئے ہیں؟" وہ مسکرا کر بولی۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے' بشرطیکہ تم اس امر کو یقینی بناؤ کہ وہ سال کے کم از کم چار مہینے ہمارے ساتھ آشرم میں گزارا کرے۔ آشرم ہی تو اس کی بنیاد ہے۔"

سوامی جی یہ سن کے بے حد خوش ہوا۔ اس کا مشن تھا کہ یوگا کا پیغام پورے ہندوستان میں پھیلایا جائے اور اس پیشکش کو قبول کرنے سے اس کا یہ مقصد پورا ہو جاتا۔ وہ باقی زندگی آرام سے گزارنے کے لیے پیسہ بچا بھی سکتا تھا۔

یوں ماں درگیشوری' شیرو اور سوامی دھنن جے مہاراج برہمچاری مئو خاندان کا اٹوٹ حصہ بن گئے۔ حتیٰ کہ وکٹر کی بہنوں اور ان کے شوہروں نے بھی اس تبدیلی کو قبول کر لیا۔

نئے آنے والے کو ناپسند کرنے والا واحد شخص تائر تھا۔ وہ کانگرس کے امیدوار کی حیثیت سے پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو گیا تھا اور اس کا وقت بمبئی اور دہلی میں بٹ گیا تھا۔ ان دونوں مقامات پر وکٹر سے ملنا دشوار تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے نئے دوستوں کے ساتھ بہت مصروف رہتا تھا۔ جب آخر کار اسے وکٹر سے تنہائی میں ملنے کا موقع میسر آیا تو وہ اسے کہنے لگا: "وکٹر! یہ تم کیسے لوگوں کو گھر میں لے آئے ہو؟ میں نے سنا ہے کہ ان میں ایک ننگی عورت بھی ہے' جو ترشول اٹھائے شیر پر سوار

رہتی ہے۔ اور ایک ڈڑھیل ہے' جو لوگوں کو سر کے بل کھڑا ہونا سکھاتا ہے۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟''

''شاید'' وکٹر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''تم ان سے ملو گے تو تم بھی پاگل ہو جاؤ گے۔ ہم جیسی تعلیم حاصل کر چکے ہیں' وہ محدود کرنے والی بھی ہو سکتی ہے۔ تمہیں بند ذہن کا مالک نہیں ہونا چاہیے۔ تم ایک کالے انگریز بن چکے ہو۔''

''مجھے یہ یاد دلانے کا شکریہ کہ میں کون ہوں۔'' نائر غرایا۔ ''میں سر کی بجائے ٹانگوں پر چلنے کو ترجیح دیتا ہوں۔''

بھارتی کے ردعمل نے اسے زیادہ مایوس کیا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ اسے بھارتی کو جھڑکنے کا حق حاصل ہو چکا ہے۔

''تم اس لمبے بالوں اور کالی ڈاڑھی والے جنگلی کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟ میں نے سنا ہے وہ تمہیں یوگا کے مختلف آسنوں کے ذریعے اپنے جسم پر قابو پانا سکھا رہا ہے۔ ینگ لیڈی' تمہیں احمق بنایا جا رہا ہے۔''

نائر! زبان سنبھال کر بات کرو' اس نے نائر کو جھڑک دیا۔ ''سوامی جی ایک حیران کن یوگا ٹیچر اور مجھے ملنے والا سب سے حیران کن مرد ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے کیونکہ وہ صرف ہندی بولتا ہے — ہندوستان کی قومی زبان۔ تم تو ہندی میں ایک جملہ بھی نہیں بول سکتے۔ تم ہمارے مل ورکروں کی اندھی حمایت کے بغیر پارلیمنٹ کے بیت الخلا تک میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔''

نائر دم بخود رہ گیا۔ کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کی دوشیزگی اس نے چند مہینے پہلے ختم کی تھی!

''کتیا!'' اس نے اپنے اندر کا سارا زہر اگلتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے تکتی رہی اور سرد' ہموار آواز میں بولی:

''اگر تم نے دوبارہ یہ لفظ زبان سے نکالا تو میں تمہارے فقیروں جیسے چہرے پر تھپڑ رسید کر دوں گی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے!''

☆☆☆

ایک ماہ بعد کمپنی کی سب سے بڑی مل جے بھگوان ٹیکسٹائلز بمبئی کے ورکروں نے ایک دن کی ہڑتال کر دی۔ انہوں نے دھمکی دی کہ اگر ان کے مطالبات پورے نہیں کیے گئے تو وہ مل بند کر دیں گے۔ وکٹر نے نائر کو ان سے ملنے اور ان کے مطالبات پر گفتگو کرنے کا کہا۔ نائر نے کہا کہ وہ ان کے ساتھ مذاکرات کرنے سے قاصر ہے کیونکہ مل ورکر اس کے ووٹر ہیں۔ اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ مناسب وقت پر بھارتی نے مل کا چارج سنبھالنا ہے لہٰذا اسے مزدوروں کے مسائل کا تجربہ حاصل کرنے دیا جائے۔ وکٹر اس سے متفق ہو گیا۔ اس نے بھارتی کو یہ معاملہ دیکھنے کا کہا۔ بھارتی نے ہوم ورک کیا۔ اس نے دوسری ملوں کے ورکروں کو دی جانے والی تنخواہوں اور جے بھگوان ٹیکسٹائلز کے ورکروں کو دی جانے والی تنخواہوں اور دیگر مراعات کا تقابلی جائزہ لیا۔ پھر اس نے مل کے احاطے میں ورکروں کی میٹنگ بلائی۔ اس نے سوامی جی کو اپنے ساتھ لے لیا کیونکہ سارے ورکر اس سے یوگا کی تربیت لیتے تھے۔ بھارتی نے خاکستری رنگ کی سادہ سی سوتی ساڑھی باندھی ہوئی تھی اور سر پر دوپٹہ لیا ہوا تھا۔ وہ سٹیج پر میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے مائیکروفون رکھا تھا۔ سوامی جی اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ساتھ والی میز پر ورکروں کے نمائندوں کے لیے مائیکروفون رکھا گیا تھا۔ اجتماع میں ہزاروں مل ورکر اور ان کی بیویاں موجود تھیں۔ بھارتی نے مختصر سی تقریر کے ذریعے اجلاس کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ''بھائیو اور بہنو! مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کو کمپنی سے کچھ شکایات ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے ان شکایات سے آگاہ کریں۔ میں یہیں ان کو دور کرنے کی

کوشش کروں گی۔ آیئے بتایئے کہ آپ کی شکایات کیا ہیں۔''

ایک آدمی اٹھ کر دوسرے مائیکروفون کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ اس نے کاغذوں کا ایک پلندہ تھاما ہوا تھا۔

''میڈم بھارتی جی'' اس نے گلا صاف کرنے کے بعد تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

بھارتی مداخلت کرتے ہوئے بولی: ''پلیز پہلے اپنا تعارف کروایئے۔ آپ مل کے کس شعبے میں کام کرتے ہیں؟''

''میں مل میں ورکر نہیں ہوں' میں آپ کی مل سمیت بمبئی کی بہت سے ملوں کے ورکروں کی نمائندگی کرنے والی ٹریڈ یونین کا لیڈر ہوں۔ میں ورکروں کے مطالبات پیش کرنا چاہتا ہوں......''

بھارتی نے دوبارہ اس کی تقریر میں مداخلت کی: ''میں تمہاری بات نہیں سننا چاہتی۔ میں صرف اپنے ورکروں کی بات سننا چاہتی ہوں۔ پلیز' بہنو اور بھائیو! کیا تمہارے اپنے درمیان کوئی ایسا فرد نہیں ہے جو مجھے بتائے کہ کیا غلط ہے؟'' اس نے کاغذوں کا پلندہ لہراتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس ہماری مل اور دوسری ملوں میں ادا کی جانے والی تنخواہوں کے اعدادوشمار ہیں۔ ہم مفت رہائش' مفت طبی خدمات' تمہارے بچوں کے لیے مفت تعلیم اور سالانہ باتنخواہ چھٹیوں کے علاوہ دوسری ملوں میں دی جانے والی تنخواہوں سے دگنی تنخواہیں دیتے ہیں۔ تمہیں جھوٹ بتایا گیا ہے۔ میں تمہاری بہن جیسی ہوں اور مجھے اس بات سے دکھ ہوا ہے کہ میرے بھائی اور بہنیں میرے والد اور مجھ سے زیادہ ایک باہر والے شخص پر اعتبار کر رہے ہیں۔ پلیز مجھے بتاؤ تمہیں کس نے اکسایا ہے۔ ہم مل کر......''

یونین لیڈر نے اس کی بات کاٹ دی اور مائیکروفون میں چیخا: ''کیا تم

اپنے استحصال کرنے والوں کی اس ناجائز اولاد کو تمہارے اپنے میں سے ایک فرد کی بے عزتی کرنے دو گے؟ اس چھوکری نے مجھے شرانگیز قرار دینے کی جسارت کی ہے! میں ایسے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ جسے یہ ساری زندگی بھلا نہیں سکے گی۔ میں......"

بھارتی ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنے بازو ورکروں کے ہجوم کی طرف پھیلائے اور بولی: "میرے بھائیو! کیا تم خاموش بیٹھے برداشت کرو گے کہ تمہاری بہن کو دھمکیاں دی جائیں؟ میں جانتی ہوں کہ مجھے سبق سکھانے سے اس کی کیا مراد ہے۔ میرے بھائیو! کیا تم ایسی غلیظ باتیں برداشت کر لو گے؟"

شور برپا ہو گیا۔ ایک ورکر کھڑا ہو گیا — اس نے یونین لیڈر کو چیخ کر مخاطب کیا: "بکواس بند کرؤ اور فوراً ہماری مل کے احاطے سے نکل جاؤ! ورنہ ہم تمہارا ایسا حشر کریں گے کہ ساری زندگی کے لیے معذور ہو جاؤ گے۔" اس نے اپنے دونوں بازو اونچے کیے اور بولا: "بھارتی بہن!" ہجوم نے مل کر کہا: "زندہ باد!"

یونین لیڈر ہاتھوں سے فحش اشارے کرتا ہوا تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ کچھ عورتیں چپلیں ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے لپکیں۔ بھارتی نے پہلا راؤنڈ جیت لیا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو واقعے کی تفصیلات سے آگاہ کیا — اس نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا: "شاباش مجھے تم پر فخر ہے۔"

تین دن بعد انگریزی' مراٹھی اور ہندی میں شائع ہونے والے افواہ ساز ہفت روزے "گرج" نے کئی صفحات پر بھارتی اور یونین لیڈر کے ٹکراؤ کی تفصیلات شائع کیں۔ اخبار نے شہ سرخی لگائی تھی "بڑے صنعت کار کی بیٹی کے ہاتھوں معزز یونین لیڈر کی بے عزتی۔" خبر کی تفصیل میں بتایا گیا تھا کہ اسے ورکروں کے مطالبات پیش کرنے سے روک دیا گیا تھا' دھمکیاں اور گالیاں دی گئی تھیں اور اجلاس سے جبراً نکال دیا گیا تھا۔ اخبار میں جے بھگوان کے دہلی والے گھر' جے بھگوان ٹاورز

اور اس کی کشتی کی تصویروں کے ساتھ ورکروں کے کوارٹروں کی تصویریں بھی شائع کی گئی تھیں۔ کیپشن تھا: ''آقا کیسے رہتا ہے اور غلام کیسے رہتے ہیں۔'' ایک جدول میں ورکروں اور ڈائریکٹروں کی تنخواہوں اور مراعات کے اعداد و شمار دیئے گئے تھے۔ اس فہرست میں نائر کا نام نہیں تھا۔ ''گرج'' کا مدیر' جو مالابار ہل کے علاقے میں پر تعیش انداز میں رہتا تھا' نائر کا قریبی دوست تھا۔ وکٹر اور بھارتی اس کی اہمیت سے بے خبر نہیں تھے۔

سوامی جی نے اخبار کا ہندی روپ پڑھا۔ وکٹر' ماں درگیشوری اور بھارتی کے ساتھ ناشتہ کرتے ہوئے اس نے کہا: ''کسی نمک حرام کا کام لگتا ہے'' اس نے کسی کا نام نہیں لیا۔

اس کے تھوڑے عرصے بعد سوامی دھنن جے رشی کیش والے آشرم میں تین مہینے گزارنے چلا گیا۔ اس کے بعد ماں درگیشوری بھی چلی گئی۔ اس نے وکٹر سے جلد واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔ وکٹر بے چینی سے اس کا منتظر رہا۔ وہ واپس آئی تو اس نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ آئندہ کبھی اتنے لمبے عرصے کے لیے اس سے دور نہیں رہے گی۔ یوں تانتری سادھوی' شیر اور یوگا ٹیچر سال کے کئی مہینے بمبئی میں گزارنے لگے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ پانچوں جے بھگوان ٹاورز کی بالائی منزلوں پر قیام پذیر رہے۔ ماں درگیشوری اور شیر و وکٹر کے پینٹ ہاؤس اپارٹمنٹ کے گیسٹ روم میں رہتے تھے۔ وہاں سے شہر اور سمندر میں لنگر انداز ''جل بھارتی'' دکھائی دیتے تھے۔ نچلی منزل میں بھارتی رہتی تھی۔ اس سے نیچے والی منزل دو حصوں میں منقسم کی گئی تھی ــــ ایک حصہ سوامی جی کو دیا گیا تھا اور دوسرا مستقل طور پر نائر کے لیے مخصوص تھا' جو پارلیمنٹ کے اجلاس نہ ہونے کی صورت میں بمبئی آ کر وہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ اب تک اسے پتا چل چکا تھا اب اسے غیر مطلوب اجنبی سمجھا جانے لگا

ہے۔ وہ بہت ضروری ہوتا تو وکٹر سے ملتا۔ ماں درگیشوری کے سلام کا جواب سر ہلا کر دیتا اور ہمیشہ انگریزی میں کہتا: ''اس درندے کو مجھ سے دور رکھو۔'' اس نے بھارتی کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ سے ملنے دفتر آتی تو نائر اسے دیکھتا بھی نہیں تھا۔ سوامی جی سے تو اسے خاص طور پر خاش تھی۔ اسے کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ اس ایتھلیٹک مسخرے نے بھارتی کے عاشق کی حیثیت سے اس کی جگہ لے لی ہے۔ وہ اس سے کم عمر اور زیادہ دلکش تھا اور یقیناً یوگا کے علاوہ دوسرے کاموں میں بھی ماہر تھا۔ سوامی جی ہمیشہ اس کے ساتھ ایک مفتوح رقیب جیسا برتاؤ کرتا تھا۔

ایک دن وہ عمارت کے چوکیدار پر برستا ہوا آیا اور نائر سے مخاطب ہوا: ''نائر صاحب! آپ میں کرودھ بہت ہے۔ یہ قبض کی طرح ہوتا ہے۔ یوگا اس پر غلبہ پانے میں آپ کی مدد کر سکتا ہے۔''

اگرچہ نائر ہندی بول نہیں سکتا تھا تاہم وہ لفظ کرودھ کا مطلب سمجھتا تھا۔ اس نے انگریزی میں جواب دیا: ''مسٹر یوگی! میں اپنے کرودھ اور اپنی قبض کا علاج کر سکتا ہوں۔ مجھے اس کے لیے سر کے بل کھڑا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تھینک یو۔'' سوامی جی کو اس کی بات پوری طرح سمجھ نہیں آئی لیکن نائر نے اسے اتنی حقارت سے دیکھا کہ سوامی نے اس کے بعد اس سے کوئی بات نہیں کی۔

اس دباؤ کا نائر کے اعصاب پر برا اثر پڑا۔ اس نے اس حوالے سے وکٹر کے ساتھ کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وکٹر کو کامیاب اور جے بھگوان انٹرپرائزز کو ملک میں سب سے خوشحال بنانے میں اس کا بڑا کردار ہے۔ وہ خود کو ناگزیر سمجھتا تھا۔ وکٹر تین بالائی منزلوں کے لیے مخصوص لفٹ میں داخل ہوا تو وہ بھی لفٹ کے اندر چلا گیا۔ ''وکٹر! میں تم سے ایک سنجیدہ بات کرنا چاہتا ہوں — لیکن ہمارے علاوہ کوئی اور نہیں ہونا چاہیے۔ تم جانتے ہو میرا کیا مطلب ہے۔''

''میں بھی تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وکٹر نے کہا ''میں کچھ عرصے ایسا کرنے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔'' اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ''اب ساڑھے نو بجے ہیں' دس بجے مجھ سے ملو۔ میرا وعدہ ہے میں تمہیں تنہا ملوں گا۔''

نائر وکٹر کے پینٹ ہاؤس گیا۔ اسے شیر کی بو آ رہی تھی۔ واضح تھا کہ وہ درندہ اور اس کی وحشی مالکن چند لمحے پہلے اس کمرے میں موجود تھے۔ عین ممکن تھا کہ شیر اندر آ جاتا اور ان دونوں کو ہڑپ کر جاتا۔ نائر نے بیٹھنے کی تکلیف نہیں کی۔

''دیکھو' وکٹر معاملات جس طرح چل رہے ہیں' یہ مجھے پسند نہیں ہے'' اس نے صاف صاف کہا۔ ''مجھے تمہارے نئے دوستوں کی سمجھ نہیں آتی۔ تمہی فیصلہ کرو کہ تم مجھے اسی طرح اپنا مشیر رکھنا چاہتے ہو جیسے میں گزشتہ تیس برس سے ہوں یا ان عجیب لوگوں کو' جنہیں تم نے اور بھارتی نے اکٹھا کیا ہے۔ میں یہ بات تمہاری اپنی بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔''

وکٹر نے بھی اسی کی طرح صاف صاف جواب دیا' تاہم اس کی آواز تھکی تھکی سی تھی' جیسے وہ جو کچھ کہہ رہا ہو' مجبوراً کہہ رہا ہو۔ ''میں مانتا ہوں کہ ہم کئی سال سے بغیر کسی بدگمانی کے اکٹھے کام کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے تمہارا سیاسی کیریئر تمہارے لیے زیادہ اہم ہے۔ میں اسے سمجھتا ہوں۔ چلو ہم آپس کی غلط فہمی کو دور کر دیں۔ ہم دوستوں کی طرح الگ ہو سکتے ہیں۔''

نائر کو یہ سننے کی توقع نہیں تھی۔ وہ کافی دیر تک اپنا سر پکڑے بیٹھا رہا۔ اسے اپنی بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے شدید غصہ آ گیا۔ وہ باپ بیٹی کو اپنے جیسے انسان کے ساتھ برا سلوک کرنے پر سبق سکھائے گا۔ وہ ایک دم اٹھتے ہوئے بولا: ''ٹھیک ہے۔ میں آج ہی اپنا استعفیٰ بھیج دوں گا۔''

نائر سے اس انداز میں جدائی نے وکٹر پر گہرا اثر ڈالا۔ وہ ساری صبح اس پر

غور کرتا رہا۔ وہ بعداز دوپہر سو بھی نہیں سکا۔ چائے پر اس نے درگیشوری اور بھارتی کو اس واقعے سے آگاہ کیا۔ بھارتی نے سوامی جی کو بتایا۔ درگیشوری کا واحد جواب تھا: ''وہ مجھے اور میرے شیرو کو پسند نہیں کرتا تھا۔ میرا خیال ہے وہ اپنے علاوہ کسی کو بھی پسند نہیں کرتا تھا۔'' پھر اس نے ایک طشت میں بخورات سلگائے اور طشت کو درگا کے بت کے سامنے گھماتے ہوئے اپنے محسن کے تحفظ کے لیے مختصر سی پوجا کی۔

سوامی جی نے صاف لفظوں میں اظہارِ خیال کیا: ''برا آدمی ہے۔ اس کی زبان زہریلی ہے۔ وہ انا پرست ہے۔ وہ مزاج کا برا اور منتقم ہے۔ اس سے محتاط رہنا۔'' بھارتی کچھ بولے بغیر ہونٹ کاٹتی رہی۔

☆☆☆

نائر کی رخصتی تک بھارتی اور سوامی جی کا رشتہ استاد اور شاگرد والا رہا۔ وہ اس کی طرف مائل تو تھی لیکن اس وقت تک پہل کرنا نہیں چاہتی تھی جب تک اسے اپنے حوالے سے سوامی جی کے احساسات کے بارے میں یقین نہ ہو جاتا۔ شاید اس نے غیر شادی شدہ رہنے کی سوگند حقیقتاً اٹھائی ہوئی ہو جیسا کہ تمام یوگیوں اور ماتاؤں کے حوالے سے سمجھا جاتا ہے۔ پس وہ اس سے یوگا کے سبق لیتی رہی اور اس کے بڑے بڑے نرم ہاتھوں کے لمس کا لطف لیتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ مزید پیشرفت کرے لیکن اس کا رویہ بے حد محتاط رہا۔ ایک روز بھارتی نے دیکھا کہ اس نے لنگی کے نیچے کچھ نہیں پہنا ہوا۔ جب وہ اس کی طرف بڑھا تو اسے ململ کی باریک لنگی کے پیچھے سے اس کا عضوتناسل کسی بھاری پینڈولم کی طرح ہلتا ہوا دکھائی دیا۔ بھارتی مسکرانے لگی۔

''تم تقریباً سب کچھ سیکھ چکی ہو'' وہ بولا۔ ''اب تمہیں صرف یہی کرنا ہے کہ یوگا کے جتنے آسن میں نے تمہیں سکھائے ہیں' ان پر عمل جاری رکھو۔''

بھارتی مایوس ہوگئی۔ ''نہیں، نہیں سوامی جی۔ مجھے ہر روز آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ ورنہ میں یہ مشقیں ترک کر دوں گی۔ میں کسی ڈسپلن کو نہیں مانتی۔ میرا باپ کہتا ہے کہ میں غصیلی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس حوالے سے کچھ کر سکتے ہیں۔''

سوامی جی تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے ڈاڑھی کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھا کیا اور بھارتی کو حکم دیا: ''پشت کے بل لیٹ جاؤ۔''

بھارتی نے اس کے حکم پر عمل کیا۔

''میں دیکھوں گا کہ کیا غلط ہے'' اس نے فیتہ نکالا اور اس کی ناف اور دونوں پیروں کے پنجوں کا فاصلہ ناپا۔

''میرے باپ نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس کی چھاتی سے پیروں کے نیچے تک ناپا تھا۔ یہ صنفی فرق کیوں؟''

سوامی جی نے دوبارہ اپنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیریں اور جواب دیا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی عورتیں اجنبی مردوں کا اپنی چھاتیوں کو چھونا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ عورتوں کی چھاتیاں مختلف جسامت کی ہوتی ہیں — کچھ بہت چھوٹی، کچھ بہت بڑی، کچھ تنی ہوئی ہوتی ہیں اور کچھ ڈھلکی ہوئی ہوتی ہیں۔''

''خوب، میری چھاتیاں ڈھلکی ہوئی نہیں ہیں اس لیے تم ان کی پیمائش کر سکتے ہو۔ میں اپنی چھاتیوں کو چھونے پر تم سے ناراض نہیں ہوں گی۔ بہرحال تم میرے گرو ہو۔ اس کے علاوہ تمہیں عورت کو جاننے کی اجازت نہیں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے؟''

وہ اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھ گئی۔ اس نے اپنا بلاؤز اتار دیا، برا کو کھول کر اتارا اور دوبارہ لیٹ گئی۔ سوامی جی نے اس کی بھٹنیوں کو چھوا، فیتہ اس کی

انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ اس کی بھٹنیاں سخت ہو گئی تھیں۔

''تمہاری چھاتیاں بہت خوبصورت ہیں'' اس نے کہا۔ ''گول گول اور سخت۔''اس نے انہیں نرمی سے تھپکا۔ ''کسی اپسرا جیسی۔''

''مجھے چومو'' اس نے حکم دیا۔

سوامی نے اس کی چھاتیوں کو باری باری چوما — ایک بار' دو بار' بیس بار' اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''اپنی لنگی میں چھپی چیز کو میرے اندر رکھ دو۔'' اس نے ساڑھی اوپر کر کے رانیں اس کے سامنے کھولتے ہوئے حکم دیا۔ اس نے اس کے اوپر آ کر لنگی ایک طرف کر کے اپنا ایستادہ عضوتناسل باہر نکالا اور اس میں دخول کیا۔ اس نے ''ہا!'' کہتے ہوئے اس کے لمبے بال پکڑ لیے اور اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ جب وہ آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہو رہا تھا تو اس کی ڈاڑھی اس کی چھاتیوں کو سہلا رہی تھی۔ ''یہ تو سورگ ہے'' بھارتی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''ہماری مقدس کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ دو محبت کرنے والوں کے درمیان مِتھن انسانی زندگی میں الوہیت کا قریب ترین مرحلہ ہوتا ہے۔'' سوامی نے جواب دیا اور تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ اس کا سانس اس کی ضربوں سے ہم آہنگ تھا۔ بھارتی ایک مرتبہ' پھر دوسری مرتبہ چھلکی۔ اس کے حلق سے زور دار آوازیں نکلیں اور پھر وہ چت لیٹ گئی۔ سوامی جی نے اپنا مادۂ منویہ اس میں خارج نہیں کیا اور عضوتناسل کو ایستادہ حالت ہی میں نکال کر دوبارہ لنگی سے ڈھانپ لیا۔

بھارتی کو نائر کے ساتھ مختصر سا جنسی عمل یاد تھا۔ اب اس نے اس یاد کو ذہن سے اس طرح جھٹک دیا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

❀ ❀ ❀

بارھواں باب

اگلے چھ مہینوں میں وکٹر نے اکیس سالہ بھارتی کو اپنے کئی کاروباروں میں مصروف کردیا۔ تائر دہلی میں تھا۔ وہ اپنی ساکھ بحال کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ اور ایک سینئر وزیر کئی دوسرے سیاست دانوں کی طرح کمیونسٹ چین کی حمایت کررہے تھے۔ مسلح افواج کے سربراہوں نے خبردار کیا تھا کہ چین جارحیت کرسکتا ہے۔ چین کے مختصر لیکن تباہ کن حملے کے بعد سب تائر کا مذاق اڑانے لگے۔ اب وہ کانگرس کے رہنماؤں کی نگاہوں میں اچھا بننے کے لیے دن رات کوشش کررہا تھا۔ اس وجہ سے جے بھگوان انٹرپرائزز میں سکون تھا۔ وکٹر اور بھارتی اور ان کا سینئر سٹاف مل جل کر اچھا کام کررہے تھے اور کارکردگی بہتر ہوئی تھی۔ جنگ میں کمپنی نے فیاضانہ حصہ لیا تھا' جس سے اس کی نیک نامی میں قابل لحاظ اضافہ ہوا تھا۔

اسی زمانے میں بھارتی کی نگرانی میں کام کرنے والے تعلقات عامہ کے شعبے کا سربراہ ایک خاص مسئلہ لے کر بھارتی سے ملا۔

''میڈم جی'' وہ بولا: ''ایک شخص ''گرج'' سے آیا ہے۔ وہ اپنے اخبار کے لیے ہم سے اشتہار مانگ رہا ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ ہم صرف قومی اخبارات کو اشتہار دیتے ہیں' مقامی اخبارات کو نہیں۔ تاہم وہ بہت اصرار کررہا ہے اور کہتا ہے کہ اگر ہم اشتہار دیں گے تو اچھا ہوگا ورنہ ہمیں اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے گا۔ وہ

آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے اندر بھیج دو، میں اس سے اکیلے میں بات کروں گی۔" بھارتی نے جواب دیا۔ وہ شخص اندر آ گیا۔ اس کا قد چھوٹا اور رنگ کالا تھا۔ اس نے ہیٹ کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ بھارتی کے سامنے کئی مرتبہ جھکا۔

"ہاں" بھارتی نے جس قدر کھردرے لہجے میں ممکن تھا کہا' "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" اس نے اسے بیٹھنے کا نہیں کہا تھا۔

"میڈم' سر' ہمیں ماں درگیشوری اور سوامی دھنن جے برہمچاری کے پس منظر کے حوالے سے ایسی اطلاع ملی ہے جو آپ کی کمپنی کی ساکھ کو نقصان پہنچائے گی۔ میرا مدیر اسے نہ چھاپنے پر راضی ہے بشرطیکہ میڈم سر اشتہارات مستقل طور پر ہمارے اخبار کو دینے پر راضی ہو جائیں۔"

بھارتی سرد نگاہوں سے اسے دیر تک گھورتی رہی۔ پھر اس نے غرا کر کہا: "بلیک میل۔ تمہاری یہ جرأت۔ فوراً دفع ہو جاؤ!" اس نے گھنٹی بجائی۔ چپڑاسی اندر آیا تو اس نے حکم دیا: "ذرا اس آدمی کو دیکھو۔ اس کا چہرہ ذہن نشین کر لو۔ اسے دفتر سے دھکے دے کر نکال دو اور دوبارہ کبھی اندر نہ آنے دینا۔"

"گرج" کے اگلے شمارے کے فرنٹ پیج پر وکٹر کی ماں درگیشوری کے ساتھ اور بھارتی کی سوامی جی کے ساتھ کھینچی گئیں تصویریں شائع کی گئیں۔ تانتری اور یوگا ٹیچر کے پس منظر کا نہایت چسکے دار قصہ بھی چھاپا گیا تھا۔ اخبار کے خصوصی نمائندے اور اس کی ریسرچ ٹیم کے مطابق ماں درگیشوری کا اصل نام شانتی دیوی تھا۔ وہ شادی شدہ تھی لیکن اس کے شوہر نے زناکاری کے شبے میں جھانسی میں اسے طلاق دے دی تھی۔ اس کے بعد وہ تین دیگر مردوں کے ساتھ رہی۔ ان تینوں نے اسے دھتکار دیا۔ اس کے بعد وہ سادھوی بن گئی۔ اب اس نے ہندوستان کے امیر

ترین شخص کو اپنا سرپرست بنالیا تھا۔ سوامی جی کا نام درگا داس تھا۔ وہ ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔ وہ سکول سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اسے چوری اور گداگری کے جرم میں دو بار بچوں کی جیل بھیجا گیا تھا۔ اس نے جیل ہی میں یوگا سیکھا تھا اور اب جے بھگوان انٹرپرائزز کے ورکروں کے علاوہ کماری بھارتی دیوی کو بھی یوگا کے آسن سکھا رہا تھا' جوکہ اپنے باپ کے ترکے کی واحد وارث تھی۔

وکٹر نے اس بدنام کر دینے والی رپورٹ کے بارے میں درگیشوری کو نہیں بتایا۔ وہ خود کبھی اخبار نہیں پڑھتی تھی۔ بھارتی نے بھی سوامی جی کو اس خبر کے بارے میں بتایا۔ سوامی جی صرف ہندی پڑھتا تھا اور انہیں "گرج" کا ہندی ایڈیشن نہیں ملا تھا۔ تاہم بھارتی نے اپنے باپ سے اس حوالے سے گفتگو کی۔

"یہ ہتک عزت ہے۔ ہم اس حرامی مدیر سے بھاری ہرجانہ وصول کر سکتے ہیں۔"

وکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا: "بچی مت بنو۔ اخبار میں ہمارے خلاف کچھ نہیں ہے' سوائے اس کے کہ دونوں ہمارے دوست ہیں۔ غصہ تھوک دو اور اس خبر کو بھلا دو۔"

"آپ کا کیا خیال ہے' اس کے پیچھے کون ہے؟ میرا خیال ہے نائر کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔"

"میرا خیال ہے وہ اتنا پست نہیں ہوسکتا۔ یہ صرف بلیک میل کی ناکام کوشش ہے۔"

بہت سے صحافیوں نے اس خبر کے حوالے سے وکٹر اور بھارتی سے ملنے کی کوشش کی۔ دونوں نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ تاہم "گرج" کو جے بھگوان انٹرپرائزز کے خلاف غلیظ مہم شروع کرنے کی بہت بھاری قیمت چکانا پڑی۔ جے

بھگوان انٹر پرائزز کو خام مال مہیا کرنے والی یا ان کی پراڈکٹس فروخت کرنے والی متعدد کمپنیوں نے ''گرج'' کو اشتہار دینا چھوڑ دیا۔ کئی ریاستی حکومتوں اور مرکزی حکومت کے کئی وزیروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اخبار کی سرکولیشن بہت کم ہوگئی۔ جے بھگوان جیسے بڑے آدمی سے ٹکرانا گھاٹے کا سودا تھا۔ وہ تو ایک قومی شخصیت اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک عملی نمونہ بن چکا تھا۔ ''ٹائمز آف انڈیا'' نے اس کے دفاع میں فرنٹ پیج پر اداریہ لکھا۔ ''گرج'' کا نام لیے بغیر زرد صحافت کی مذمت کی گئی۔ اداریئے میں ٹریڈ یونین ازم کی بھی مذمت کی گئی جس کی وجہ سے کئی صنعتیں دم توڑ چکی تھیں۔ غیر ذمہ دار سیاستدانوں کو بھی لتاڑا گیا تھا جو ورکروں کو گمراہ کر کے ہڑتالیں کرواتے تھے۔ اداریئے میں ملک کو ٹیکسٹائلز، چینی، سٹیل، سیمنٹ، ادویات وغیرہ میں خود کفیل بنانے میں جے بھگوان کے کارناموں کا ذکر کیا گیا۔ قوم کو یاد دلایا گیا کہ حالیہ جنگ کے دوران اس نے کتنی قابل قدر خدمات انجام دی تھیں۔ اداریئے کے اختتامی الفاظ تھے: ''جو لوگ چاند پر تھوکتے ہیں، تھوک انہی کے چہرے پر گرتی ہے۔''

غلیظ مہم ختم ہوگئی۔ صرف یہ ہوا کہ انہیں بہت سے گمنام خط ملنے لگے، جن میں روپے کا مطالبہ کیا گیا ہوتا تھا یا گالیاں لکھی ہوتی تھیں۔ ایک ہی ادارے میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کی نجی زندگیوں کے حوالے سے گمنام خط لکھنا ایک قومی مشغلہ تھا۔ جب بھی کسی کو ترقی ملتی یا کسی عہدے پر متعین کیا جاتا، گمنام خطوں میں الزام لگایا جاتا کہ اس شخص نے یا اس کی بیوی نے اس کام کے لیے انتظامیہ کے کسی رکن کو خوش کیا ہے۔ وکٹر اس وقت تک ایسے خطوں کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ انہیں پڑھ کر مزا تو لیتا تھا لیکن کبھی انہیں سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ بعض خطوں میں، جو مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہوتے تھے، اسے اور اس کے گھر والوں کو گالیاں

لکھی گئی ہوتی تھیں۔ وکٹر انہیں پڑھ کر بھی مسکرا دیتا اور انہیں پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا۔ تیسری قسم کے خطوں میں اسے حکم دیا گیا ہوتا تھا کہ وہ کرنسی نوٹوں کا پیکٹ بنا کر ایک خاص وقت اور مقام پر کسی کے حوالے کر دے جو وہاں اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ دھمکی دی گئی ہوتی تھی کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو اس کی کسی مل کو آگ لگا دی جائے گی یا اس کی بیٹی کو اغوا کرلیا جائے گا۔ مل کو جلانے کی دھمکی وکٹر کو زیادہ پریشان نہیں کرتی تھی لیکن بھارتی تو اس کی جان تھی۔ وہ اس کے تحفظ کے حوالے سے بہت فکرمند ہوجاتا تھا۔ وہ اکثر تنہا شاپنگ کرنے یا کبھی کبھار میرین ڈرائیور پر چوپاٹی سے نریمان پوائنٹ تک سیر کرنے چلی جاتی تھی۔ اسے بہت سے لوگ پہچانتے تھے۔ اس نے پولیس سے کبھی مدد نہیں مانگی۔ مشہور تھا کہ بمبئی کی پولیس مجرموں سے ملی ہوئی ہے۔ اس نے بھارتی کو بتائے بغیر اپنے سب سے سینئر سکیورٹی گارڈ کو اس کے تعاقب پر مامور کردیا۔ وہ ہر جگہ اس کے پیچھے جاتا تھا اور اس کی واپسی کے بارے میں وکٹر کو اطلاع دیتا تھا کہ وہ کب گھر پہنچی تھی۔ اس کا تحفظ وکٹر کے ذہن پر بوجھ بننے لگا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ بہت مغرور اور بے احتیاط تھی۔

☆☆☆

وکٹر اور بھارتی دہلی میں تھے کہ وکٹر کی شوگر کی مریضہ' تقریباً نابینا' 80 سالہ ماں بیمار پڑ گئی۔ وہ کوما میں چلی گئی اور صحت یاب نہ ہوسکی۔ وکٹر آخری لمحوں میں اس کا ہاتھ تھامے اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اسی شام اس کی چتا جلا دی گئی۔ سارا خاندان اس کے باپ کی راکھ کی طرح اس کی ماں کی راکھ لے کر ہردوار گیا' جہاں اسے گنگا میں بہا دیا گیا۔ اس مرتبہ بھارتی کے اصرار پر وکٹر نے سر منڈا لیا۔ دہلی واپس جانے کی بجائے اس نے اپنے خاندان کو ہالیڈے ہوم میں چند دن گزارنے کا کہا۔ شام کو اس نے کار بھیج کر آشرم سے ماں درگیشوری کو بلا لیا۔

درگیشوری شیرو کو اپنے ساتھ نہیں لائی کیونکہ اس شام وہ بہت سے کام کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اس نے وکٹر کا منڈا ہوا سر دیکھا اور سمجھ گئی کہ کیا ہوا ہے۔

''اوم نموشوا' اوم نموشوا'' وہ اونچی آواز میں گانے لگی۔ ''گویا ماتا جی سورگ چلی گئیں۔ انہیں بھگوان شیو کے کنول قدموں کے پاس جگہ ملے گی۔''

وہ کچھ دیر چپ بیٹھے رہے۔ اس نے وکٹر کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے۔ اس نے دیکھا کہ بھارتی اور اس کی پھوپھیاں بھی رو رہی تھیں اور اپنے دوپٹوں سے ناک پونچھ رہی تھیں۔

''ایسے فرد کی موت پر رونا اچھا نہیں ہے' جس نے بھرپور زندگی گزاری ہو اور نروان پا لیا ہو۔ اس موقع پر تو خوشی منانی چاہیے۔'' اس نے انہیں دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

اس کے الفاظ نے اثر دکھایا۔ وہ شام کی پوجا کا وقت ہوجانے تک وہیں رہی۔ رخصت ہوتے وقت وہ بولی: ''کل صبح ہم آشرم میں اس کی روح کے سکون کے لیے خصوصی پوجا کریں گے۔ تم سب دہلی واپس جاتے ہوئے آشرم ضرور آنا۔''

وہ پوجا کے لیے آشرم گئے۔ وکٹر نے دیکھا کہ اس کی دی ہوئی گرو دکشنا کا اچھا استعمال کیا گیا تھا۔ مندر اور مراقبہ ہال کی طرح بھگتوں کے رہنے کے لیے مخصوص سارے کمرے پکے بنا دیئے گئے تھے۔ انہوں نے ایک مالی کو ملازم رکھ لیا تھا۔ سبزیاں دگنے رقبے میں اگائی جانے لگی تھیں' گیٹ سے اندر آنے والے راستے کی دونوں اطراف پھول اگے ہوئے تھے اور کئی دیواروں کو پھولدار بوگن ویلیا نے ڈھانپ رکھا تھا۔ بھگتوں کی تعداد بھی زیادہ لگتی تھی۔

پوجا آدھا گھنٹہ جاری رہی۔ ماں درگیشوری نے گہری' سحر انگیز آواز میں سنسکرت اشلوک پڑھے۔ جب وہ عروج پر پہنچی تو آشرم میں رہنے والی انگریز عورت

اٹھ کر اپنی تانتری گرو کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ وہ پانی سے باہر نکلی ہوئی کسی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ آرتی کے بعد ماں درگیشوری نے اس عورت کو اٹھایا اور اسے آشیرواد دی۔

جب وہ لوگ اپنی کاروں میں بیٹھ رہے تھے تب درگیشوری نے وکٹر سے کہا: ''میں تمہارے ساتھ چند دن دہلی میں رہنا چاہتی ہوں۔ کیا تم کل یا پرسوں میرے لیے کار بھجوا دو گے؟''

وکٹر نے سر ہلا کر ہاں کہی۔ ''چوتھے کے بعد میری دو بہنیں چلی جائیں گی۔ گھر میں تیسری بہن اور اس کا خاوند ہوگا۔''

چوتھے کے بعد تعزیت کرنے والوں کی لگاتار آمد کا سلسلہ ایک دم ختم ہوگیا۔ بھارتی بمبئی چلی گئی۔ وکٹر کی دو بہنیں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئیں۔ اس کے آئی سی ایس بہنوئی اور اس کی بیوی نے کلکتہ جا کر بہنوئی کے ماں باپ کو ملنے کا فیصلہ کیا۔ وکٹر نے درگیشوری کو لانے کے لیے کار بھیج دی۔

وہ گھر میں اکیلے تھے لیکن وکٹر نے احتیاطاً اپنی مہمان کو ویلیری کے کاٹیج میں رکھا۔ وہ کاٹیج بڑے گھر کے مقابلے میں محبت کرنے کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ وکٹر کا ذاتی ملازم چھوٹے سے سٹنگ روم کی میز پر سکاچ کی بوتل، سوڈا، برف اور شیشے کے جام رکھ گیا۔ درگیشوری نے اس کی مے نوشی پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔

''ذرا مجھے بھی تو اس شے کو چکھنے دو، جسے تم پینا اتنا پسند کرتے ہو۔'' اس نے دوبارہ کہا۔ ''اوہ، یہ تو بے مزہ ہے — یہ تو میرے حلق سے آگ کی طرح اتری ہے۔ تاہم اس نے مجھے ہلکا سا سرور دیا ہے۔ میتھن سے پہلے یہ احساس اچھا لگتا ہے۔''

انہوں نے محبت کی۔ درگیشوری مہربان اور دھیمی تھی۔ اس نے وکٹر کے

ساتھ ماں جیسا سلوک کیا کیونکہ وہ اپنی ماں کو کھو چکا تھا۔

''میں تمہیں ایک نئی چیز سکھاؤں گی۔'' وہ طویل بوسوں کے درمیان بولی۔ ''ہم ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے پہلو کے بل لیٹ جائیں گے۔ تم دخول کے بعد زیادہ پرجوش ہوئے بغیر میرے اندر قیام کرنا۔ کسی ایسی عورت کے بارے میں مت سوچنا جس کے ساتھ تم محبت کر چکے ہو یا کرنا چاہتے ہو' اپنے ذہن سے سارے خیال نکال دینا۔ میں تمہیں دوہوں گی۔ اپنے بندو کو محفوظ رکھنا تاکہ بار بار کرسکو۔''

پس وہ دونوں ایک دوسرے کو بانہوں میں لے کر لیٹ گئے۔ وکٹر کے ہاتھ اس کی چھاتیوں سے کھیل رہے تھے۔

''میں تھک گئی ہوں۔'' درگیشوری نرمی سے اسے اپنے میں سے نکالتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے جھک کر اس کے قضیب کو چوما' جو ابھی تک کسی بانس کی طرح سخت اور تنا ہوا تھا۔ وکٹر کو انوکھا سا سکون محسوس ہوا۔ وہ اپنے آپ کو ساری دنیا سے بلند محسوس کر رہا تھا۔ انہوں نے مسلسل تین شامیں اسی طرح گزاریں۔ ہر مرتبہ وکٹر اس کے جسم سے زیادہ فتح مند اور ہلکا پھلکا ہو کر ابھرا۔ اس کا ذہن بہت صاف ہوگیا تھا۔ وہ زیادہ کام کرنے لگا۔ وہ اپنی عادت کے خلاف اپنے ملنے والے ہر فرد سے مذاق کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے۔

افسوس ہر اچھی شے کا انجام ضرور ہوتا ہے۔ ایسا ہی اس کے ساتھ ہوا۔ ایک دن اسے صبح سویرے بھارتی کا فون ملا: ''پاپی! ہماری ایک ٹیکسٹائل مل کے ایک حصے میں کل رات آگ لگ گئی۔ ہر شے تباہ ہوگئی ہے۔'' اس کی آواز غیر معمولی حد تک قابو میں تھی۔ ''میں جائزہ لینے وہاں جارہی ہوں۔ آپ جتنی جلدی ہو سکے آجائیں۔'' وکٹر کو اس کے تحفظ کی فکر تھی۔ ''بھارتی! تمہیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جنرل منیجر سارا معاملہ سنبھال لے گا۔ کیا تم نے پولیس

کو اطلاع دے دی ہے؟"

"ہاں، پاپی"۔ اس نے جواب دیا۔ "جی ایم وہاں موجود ہے۔ پولیس بھی موجود ہے۔ یونین انتظامیہ کے خلاف مظاہرہ کررہی ہے۔ مجھے لازماً وہاں جانا چاہیے۔آپ جتنی جلدی ممکن ہو، آجائیں۔"

وکٹر نے درگیشوری کو بتایا۔ "میں تمہیں تنہا نہیں جانے دوں گی۔میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ اگلی فلائٹ سے بمبئی چلے گئے۔ ایئرپورٹ پر مل کا جی ایم اور کچھ پولیس افسر موجود تھے۔ جی ایم نے وکٹر کو ساری تفصیلات سے آگاہ کیا۔ "سر، صورتحال نازک ہوچکی ہے۔ آگ میں جل کر ہلاک ہو جانے والے ورکروں کے کریا کرم کے بعد دوسری ملوں کے ورکروں نے ہڑتال کردی ہے اور آپ کی مل کے باہر مظاہرہ کررہے ہیں۔"

مل ایئرپورٹ سے جے بھگوان ٹاورز جانے والے راستے میں ہی تھی۔ پولیس نے اسے دوسرے راستے سے جانے کا مشورہ دیا۔ وکٹر نے اس مشورے کو نظرانداز کردیا۔ "میں ابھی مل جاؤں گا۔ میری بیٹی کہاں ہے؟"

"سر ہماری التجاؤں کے باوجود وہ مل چلی گئی ہیں۔ہم نے ان کے تحفظ کا مناسب انتظام کردیا ہے۔"

وکٹر اور ماں درگیشوری مل چلے گئے۔ باہر ایک بڑا ہجوم موجود تھا۔ لاٹھیوں سے مسلح پولیس والے ورکروں کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ پولیس نے سڑک صاف کروائی او روکٹر کی کار کے مل میں داخل ہونے کے لیے گیٹ کھول دیئے۔

بھارتی انہیں گیٹ کے قریب ہی ملی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہورہا تھا۔

"یہ بیرونی لوگوں کا کام ہے۔" اس نے غصے سے کہا: "میں نے اپنے

ورکروں سے بات کی ہے۔ انہوں نے حلفیہ کہا ہے کہ اس معاملے سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''ہم پاگل نہیں ہیں کہ اپنے مائی باپ کو' اپنے ان داتا کو ہلاک کریں گے۔''

''تو پھر کس نے یہ کام کیا ہے؟ اور کیوں؟'' وکٹر نے پوچھا۔ ''اور سڑک پر یہ بیرونی لوگ کون ہیں؟''

''وہ مختلف یونینوں کے اراکین ہیں۔ جو شخص پچھلی مرتبہ اس کا لیڈر بنا ہوا تھا' وہی اس بار بھی ان کا لیڈر ہے۔''

وکٹر نے پولیس سے کہا کہ وہ اس کی مل کے ورکروں کو اندر آنے دے تاکہ وہ ان سے گفتگو کر سکے۔ پہلے تو انچارج افسر ہچکچایا لیکن وکٹر نے اصرار کیا: ''وہ میرے آدمی ہیں' مجھے ان سے کوئی خوف نہیں ہے۔ پلیز وہی کرو' جو میں کہتا ہوں۔''

پولیس مین نے میگافون پر اعلان کیا۔ ورکر قطار بنا کر اندر آنے لگے۔ وہ وکٹر کے سامنے جھکتے اور زمین پر بیٹھ جاتے۔

وکٹر نے ان سے مخاطب ہو کر پوچھا: ''کیا تمہیں انتظامیہ سے کوئی شکایت ہے؟'' اس کے سوال کا جواب خاموشی سے دیا گیا۔

اس نے مل کے جلے ہوئے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''ہم یعنی تم اور میں مل کے اس حصے کو دوبارہ تعمیر کر لیں گے۔ ہم آگ میں جل جانے والے اپنے تین ساتھی ورکروں کو دوبارہ کبھی زندہ نہیں کر سکتے اور ہم سب کو اسی دکھ کے ساتھ ساری زندگی جینا ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے ان کے مرنے کا غم ساری عمر رہے گا اور میرا خیال ہے اتنے برسوں کے ساتھی ہونے کے ناطے مجھے اس امر کو تم پر ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مجھ پر یقین کرو یا نہیں' تمہاری مرضی ہے۔ میں انتظامیہ کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ مرحومین کے پسماندگان کو ایک ایک

لاکھ روپے ادا کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ہم ان کی بیواؤں اور بیٹوں کو مل میں ملازمت بھی دیں گے۔"

فلک شگاف نعرے لگنے لگے: "جے بھگوان کی جے۔"

"اگر تم سننا چاہتے ہو کہ باہر مظاہرے کے لیڈر کو کیا کہنا ہے تو میں اسے تم سے خطاب کرنے کے لیے اندر بلا لیتا ہوں۔"

وہ سرگوشیوں میں اسے بلانے کا کہنے لگے۔ وکٹر نے اپنے قریب کھڑے انسپکٹر کو کہا کہ وہ باہر جا کر یونین لیڈر سے پوچھے کہ کیا وہ ورکروں سے خطاب کرنا چاہتا ہے۔ یونین لیڈر اکڑ کر چلتا ہوا مائیکروفون کے سامنے پہنچا۔ "بھائیو اور بہنو! ہم ساتھی ورکر ہیں۔ ہمارے مفادات مشترک ہیں۔ ہم ......"

وکٹر نے اس کی تقریر میں مداخلت کرتے ہوئے کہا: "تم کسی مل میں کام نہیں کرتے۔ انہیں سچ بتاؤ۔"

"جے بھگوان! تم چاہتے تھے کہ میں تقریر کروں' لہٰذا اب مداخلت مت کرو۔" لیڈر نے کرخت لہجے میں کہا اور تقریر کرنے لگا: "جیسا کہ میں کہہ رہا تھا' ہمارے مفادات مشترک ہیں۔ ہمیں اپنا استحصال کرنے والے سرمایہ داروں کے خلاف متحد ہونا پڑے گا۔ ہم جھونپڑیوں اور کچے مکانوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔ کیا تم نے ان لوگوں کے محل دیکھے ہیں' جن میں یہ بے شمار نوکروں کے ساتھ رہتے ہیں؟ تمہارے مل مالک کے پاس تو ایک بحری جہاز بھی ہے' جس پر یہ اپنے دن رات گزارتا ہے' اسی لیے اسے علم ہی نہیں ہے کہ بمبئی کے غریب کس طرح جی رہے ہیں۔ وہیں یہ اپنے دوستوں کی دعوتیں کرتا ہے' ان دوستوں میں نیم عریاں سادھوی بھی شامل ہے جسے تم ڈائس پر اس کے ساتھ بیٹھا دیکھ رہے ہو۔ میرا مقصد کسی پر ذاتی حملہ کرنا نہیں ہے۔" آخری جملہ اس نے وکٹر اور درگیشوری کی طرف مڑتے

ہوئے کہا تھا۔

درگیشوری کے اشارے پر وکٹر نے اپنے غصے کو ظاہر کیا۔ اس نے جو کچھ کیا وہ اس ے کردار سے ماورا تھا۔ وہ اپنی کرسی سے کسی چیتے کی طرح اٹھا اور یونین لیڈر کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ ڈائس سے نیچے جا گرا۔ ورکروں کے ہجوم میں شور برپا ہوگیا۔ ایک پولیس افسر نے سیٹی بجائی۔ پولیس والوں نے بڑھ کر یونین لیڈر کو اٹھنے میں مدد دی اور باہر لے جانے لگے۔ یونین لیڈر گالیاں بکنے لگا: ''حرام زادہ' مادر...... اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ بھین......تم ایک ورکر لیڈر کو مارنے کا نتیجہ جلد بھگتو گے!''

ہجوم سے کوئی چیخا: ''صاحب! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ صرف اس منحوس سادھوی کی خاطر؟ کیا وہ آپ کے لیے ہم سے زیادہ اہم ہے؟ وہ شیطان ہے' وہ ہمیں برباد کردے گی۔''

وکٹر تیزی سے ڈائس سے اترا اور ہجوم میں چلا گیا: ''کس نے کی ہے یہ بات؟ میرے سامنے آؤ!'' اس نے گرج کے کہا۔

ہر طرف گہری خاموشی طاری ہوگئی۔ کسی نے اسے اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ بھارتی نیچے آئی اور اسے بازو سے تھام کر ایک طرف لے جانے لگی۔ ''آجایئے پاپی۔ یہ لوگ آپ کے معیار کے نہیں ہیں۔''

وہ خاموشی سے جے بھگوان ٹاورز چلے گئے۔ جب وہ وکٹر کے سٹنگ روم میں دوبارہ اکٹھے ہوئے تو ان میں بہت کم باتیں ہوئیں۔

''مجھے اس حرامزادے کو نہیں مارنا چاہیے تھا۔ میں نے زندگی بھر کسی کو نہیں مارا۔ مجھے نہیں پتا' مجھے کیا ہوگیا تھا۔''

''انسان غصے میں دلیل سے کام نہیں لیتا۔'' درگیشوری نے نرمی سے کہا۔

"خیر جو ہوا' سو ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آگے کیا ہوتا ہے۔"

"میں اندازہ لگا سکتا ہوں۔" وکٹر بولا۔ "اخبارات مجھ پر چڑھائی کر دیں گے۔ وہ شخص مجھے عدالت میں لے جائے گا۔ میں ہندوستان کا ولن نمبر ایک بن جاؤں گا۔"

"بہرحال آپ نے ملک کی خدمت کی ہے۔" بھارتی نے کہا۔ "فکر مت کریں' سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ماں درگیشوری خاموش تھی۔ اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

وکٹر اس رات بہت کم سویا۔ اس نے جتنا اس معاملے پر غور کیا' اسے یقین ہوتا گیا کہ یونین کے احتجاج کے پیچھے نائر ہے اور "گرج" کی اس کے خلاف چلائی ہوئی مہم کو بھی اسی نے شروع کروایا تھا۔ ممکن ہے مل میں آگ اس نے نہ لگوائی ہو' تاہم وکٹر کو اس کے ملوث نہ ہونے کا پورا یقین نہیں تھا۔ یہ سچ تھا کہ نائر نے اسے ہندوستان کے بارے میں سوچنے کی تحریک دی تھی اور اس کی کتاب چھاپنے میں مدد دی تھی۔ لیکن وکٹر نے بھی تو اس کی زندگی کو سنوارا تھا' اسے ملک کا سب سے زیادہ تنخواہ پانے والا منتظم بنا دیا تھا' اسے ایک ایسے حلقے سے پارلیمینٹ کا رکن منتخب ہونے میں مدد دی تھی جس میں کوئی ملیالم جانتا تھا' نہ انگریزی۔ آخر نائر اس کا دشمن کیوں بنا؟ اس نے کسی سے سنا تھا کہ تم کسی سے بھلائی کرو اور زندگی بھر کے لیے اپنا ایک دشمن بنا لو۔ اس وقت اس نے اس بات پر یقین نہیں کیا تھا لیکن اب نائر کی وجہ سے وہ اس نقطۂ نظر کو مان گیا تھا۔

وکٹر اب بھی اپنے آپ سے بحث کر رہا تھا۔ وہ نائر والے تلخ تجربے کو اپنے ہم وطنوں پر منطبق نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کئی طریقوں سے اس کا شکریہ ادا کر چکے تھے۔ کچھ لوگوں کو ایک غریب ملک میں اس کے پرتعیش طرزِ حیات پر

اعتراض تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنی خون پسینے کی کمائی سے اس طرح رہتا ہے۔ شاید ''جل بھارتی'' فضول خرچی میں شمار ہوتی تھی۔ تاہم اب وہ ان لوگوں سے بچنے کے لیے اس کی جنت تھی، جن سے وہ بہت کم اشتراک رکھتا تھا۔ نائر کی منافقت کے بعد اسے ہمیشہ سے زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اپنے تیرتے ہوئے جزیرے کو ساحل سے دور لے جائے۔ وہ اپنے آپ کو یاد دلا رہا تھا کہ وہ نائر ''گرج'' کے مدیر اور خود کو یونین لیڈر کہلانے والے پیشہ ور تخریب کار کے ہاتھوں پاگل نہیں ہوگا۔ اسے باپو گاندھی کی سنائی ہوئی بھگوت گیتا کی سطریں یاد آئیں: تمہارا فرض ہے کہ تم وہ کام کرو جو تمہیں سونپا گیا ہے، یہ نہیں کہ انعام کے پھل شمار کرو۔

اس نے ان سطروں کو بار بار پڑھا اور پرسکون ہو گیا۔

وہ صبح جلدی اٹھ گیا۔ اس نے دوسروں کو اطلاع کروا دی کہ وہ چند دنوں کے لیے اپنی کشتی پر جا رہا ہے، اگر کوئی ساتھ جانا چاہے تو وہ اسے خوش آمدید کہے گا۔ انہوں نے اتفاق کیا کہ یہ ایک اچھا آئیڈیا ہے۔ وہ سورج طلوع ہونے سے کافی پہلے جے بھگوان ٹاورز سے روانہ ہو گئے۔ صرف صبح کی سیر کرنے والے میرین ڈرائیو پر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے گیٹ وے آف انڈیا کے قریب ایک سٹال سے صبح کے اخبار خریدے۔

جب وہ جل بھارتی کے سیڑھیوں کے قریب آ جانے کا انتظار کر رہے تھے، وکٹر اخباروں کی سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ ہر اخبار کے فرنٹ پیج پر اسی کا تذکرہ تھا۔ انہوں نے یونین لیڈر کا انٹرویو بھی شائع کیا تھا، جس نے کہا تھا کہ وہ خود پر قاتلانہ حملے کے الزام میں اسے عدالت میں لے جائے گا۔ وکٹر کو یقین تھا کہ ''گرج'' نے اس کے دوستوں کے ساتھ اس کی تصویریں اور ان کی نجی زندگیوں کی کہانیاں چھاپی ہوں گی۔ اس نے سوچا کہ کھلے سمندر میں صحافی اسے تنگ

نہیں کر سکیں گے۔ وہ اپنے تعلقات عامہ کو انہیں بہتر طریقے سے سنبھالنے کا کہہ دے گا۔

وکٹر عرشے پر کافی دیر ٹہلتا اور ذہن سے پریشانی دور کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اپنے ملک اور اس کے عوام کے لیے اچھے کام کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دونوں سے ایک باعزت فاصلے پر رہا جائے۔ فاصلہ معروضیت اور ایک زیادہ صاف تناظر عطا کرتا ہے۔ قربت سے خامیاں نمایاں ہوجاتی ہیں — اور خامیاں اتنی زیادہ تھیں کہ انہوں نے ہر شے کو بھدا اور کریہہ بنا دیا تھا۔ جل بھارتی خریدنے کا آئیڈیا بڑا شاندار تھا۔ اس کے ذریعے ہندوستان میں رہتے ہوئے بھی اس سے دور جاسکتا تھا۔ تازہ پانی اور کھانے پینے کی اشیاء لانے والی موٹر بوٹ کے ذریعے سینئر ایگزیکٹو فوری اہمیت کی فائلوں پر اس کے احکامات لینے آجاتے تھے۔ کام متاثر نہیں ہوتا تھا۔ یہ انتظام مثالی تھا۔ وہ جلد ہی جل بھارتی کو اپنا مستقل مرکز بنانے والا تھا۔

جب اسے ذہنی سکون مل گیا' تو وہ بمبئی واپس آ گیا۔ اسے اپنی مل کے جلے ہوئے حصے کے دوبارہ تعمیر ہونے اور دوبارہ کام کرنے تک بمبئی میں ٹھہرنا پڑتا۔ اس میں چند مہینے لگ جاتے۔ اس نے سارا کام بھارتی پر چھوڑ دیا۔

اس دوران اس نے اپنے خلاف یونین لیڈر کی شکایت کے نتیجے کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اسے پتا چلا کہ پولیس نے اس کی ایف آئی آر درج نہیں کی تھی اور اسے کہا تھا کہ اگر وہ مقدمہ کرنا چاہتا ہے تو کسی وکیل کے ذریعے کرے۔ اس شخص نے مقدمہ درج کرانے کا ارادہ ترک کردیا اور وکٹر اور پولیس کے خلاف اخبارات کا رخ کیا۔ صرف ''گرج'' نے اس کی حمایت کی۔ تمام اہم اخبارات اور رسائل نے وکٹر اور جے بھگوان انٹرپرائزز کے حق میں لکھا تھا۔

یونین لیڈر پریشان ہوکر آخر نائر کے پاس پہنچا' جو ورکروں کے ووٹوں کی وجہ سے اس کا احسان مند تھا۔ انہی ووٹوں نے اسے پارلیمینٹ میں پہنچایا تھا۔ نائر' وکٹر' اس کی بیٹی اور ان کے نئے دوستوں سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے فیکٹری ورکروں میں ہونے والی حالیہ گڑ بڑ اور پولیس کے جابرانہ ہتھکنڈوں کے بارے میں وزیر محنت سے سخت لفظوں میں سوال پوچھا۔ وہ خود وزیر محنت بننا چاہتا تھا۔ وزیر نے سادہ سا جواب دیا' ''ایوان کی میز پر ایک بیان رکھ دیا گیا ہے۔'' اس بیان میں کہا گیا تھا کہ ملک میں کسی جگہ ورکروں میں گڑبڑ نہیں ہوئی۔ نائر اضافی سوال کرنے اٹھا اور جوش میں یہ بھول گیا کہ وزیر اسی کی پارٹی کا ہے۔ اس نے ''گرج'' کا ایک شمارہ لہراتے ہوئے چیخ کر کہا: ''معزز وزیر کہتے ہیں کہ کہیں کوئی گڑ بڑ نہیں ہے۔ میں ان کی توجہ اس ہفت روزے میں شائع ہونے والی خبروں کی طرف دلانا چاہتا ہوں' جن کے مطابق بمبئی کی سب سے بڑی ٹیکسٹائل مل میں تشدد کے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ مل مالک نے ایک معزز یونین لیڈر کی بے عزتی کی اور اس پر حملہ کیا۔ سرمایہ دار پریس نے سازش کے تحت خاموشی اختیار کرلی۔ صرف ایک ترقی پسند اخبار نے سچ چھاپنے کی جرأت کی ہے۔'' اس نے جاکر ''گرج'' کا شمارہ وزیر کو دیا۔ ایوان کی پچھلی نشستوں سے کسی رکن نے چلا کر کہا: ''نمک حرام۔''

نائر اپنی نشست کی طرف جاتے ہوئے رک گیا اور چلایا: ''مجھے نمک حرام کہنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

تین آوازوں نے جواب دیا: ''تم نمک حرام ہو۔ تم نے نہ صرف اپنے پارٹی کولیگ پر حملہ کیا ہے بلکہ تم نے اپنے محسن کی پشت میں بھی چھرا گھونپا ہے۔ تم نے کتنے سال جے بھگوان کا نمک کھایا ہے؟''

نائر کی طرف سے اپوزیشن نے احتجاج کیا۔ وہ اس بحث سے لطف لے

رہے تھے۔ سپیکر اٹھ گیا اور بولا: ''لفظ نمک حرام غیر پارلیمانی ہے۔ اسے ریکارڈ سے حذف کیا جا رہا ہے۔''

نائر واضح طور پر پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے سپیکر سے مخاطب ہوا: ''مسٹر سپیکر! مجھے مزید کچھ نہیں کہنا۔ ان سرمایہ داروں نے نہ صرف اس ملک کے اخبارات کو اپنا تابع بنا لیا ہے بلکہ پارلیمنٹ کے کچھ رکن بھی ان کی جیبوں میں ہیں۔''

اس پر ایوان میں شور مچ گیا۔ سپیکر نے کہا: ''تم نے ایوان کا وقار مجروح کیا ہے۔ یہ بات بھی ریکارڈ پر نہیں لائی جائے گی۔''

''سر! میں احتجاجاً ایوان سے واک آؤٹ کر رہا ہوں۔'' وہ ایوان سے باہر چلا گیا۔ اراکین زور زور سے ڈیسک بجانے اور نعرے لگانے لگے۔

اگلی صبح کے اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں نے نائر کے غصے کو مزید بھڑکا دیا۔ انہوں نے اس کے خلاف استعمال ہونے والی غیر پارلیمانی زبان کا حوالہ نہیں دیا تھا لیکن تفصیل سے لکھا تھا کہ اس نے کس طرح اپنے ہی وزیر پر تنقید کی تھی، کس طرح غصے میں واک آؤٹ کیا تھا اور اس کے واک آؤٹ پر باقی اراکین کس طرح خوش ہوئے تھے۔ اخبارات نے تفصیل سے لکھا تھا کہ نائر جے بھگوان انٹرپرائزز میں ملازم رہا تھا اور ایک ایسے حلقے سے پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہوا تھا جس میں اس کے آجر کی ملوں کے ورکر بڑی تعداد میں رہتے تھے۔ اشارہ واضح تھا یعنی نائر نے اپنے محسن سے بے وفائی کی تھی۔

❀❀❀

تیرہواں باب

ماں درگیشوری وکٹر سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ زندگی بھر اپنے کسی فیصلے یا اس کے نتائج کے حوالے سے اتنی فکر مند نہیں ہوئی تھی جتنی اب تھی۔ اس نے کشتی میں اس موضوع پر بات کی نہ ہی جے بھگوان ٹاورز واپسی کے چند دن بعد تک۔ تاہم وہ زیادہ عرصہ خاموش نہ رہ سکی۔ ایک صبح ناشتے کے بعد وکٹر کے ساتھ اس کے پینٹ ہاؤس کی بالکونی میں بیٹھے ہوئے اس نے وکٹر سے کہا: "اب میرے آشرم واپس چلے جانے کا وقت آ گیا ہے۔"

وکٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "درگیش میں نے خود غرضی سے کام لیا ہے۔ تمہیں شیرو یاد آ رہا ہوگا۔ ہم اگلے ہفتے جا کر شیرو کو لے آئیں گے۔ میں ہوائی جہاز چارٹر کروا لوں گا۔ مجھے پہلے اس کا خیال آ جانا چاہیے تھا......"

"تم نہیں سمجھے۔" درگیشوری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "میں ہمیشہ کے لیے آشرم واپس جانے کا کہہ رہی ہوں۔"

وکٹر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ "میں سمجھا نہیں تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟"

"ہم اس لیے اکٹھے تھے کہ ایک دوسرے کو خوشی دے رہے تھے۔" درگیشوری نے وضاحت کی۔ "ہم اچھا وقت گزار چکے ہیں۔ اب ہم ایک دوسرے کی زندگیوں میں صرف دکھ لا رہے ہیں۔"

''بچی مت بنو' درگیش۔ تم ان مل والے احمقوں کی باتیں یاد کررہی ہو۔ تمہیں وہ باتیں اپنے ذہن سے نکال دینی چاہیے تھیں۔ وہ معاملہ ختم ہوچکا ہے۔ تم ضرورت سے زیادہ ردعمل ظاہر کررہی ہو۔''

درگیشوری نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کرایا۔ ''معاملہ ختم نہیں ہوا۔ زیادہ ردعمل تم نے مل میں ظاہر کیا تھا۔ میں نے تمہیں شروع میں بتا دیا تھا کہ ہمیں آزاد رہنا ہوگا۔ ہمارے تمہارے بیچ سمبندھ ہوگا' بندھن نہیں۔ تم میرے ساتھ خاوند والا سلوک کررہے ہو۔ تم نے اپنی ساکھ کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور غیرضروری طور پر لوگوں کو دشمن بنا لیا ہے۔ ہم ہمیشہ لوگوں کی نظروں میں رہیں گے۔ اب ہمیں آزادی بالکل میسر نہیں ہوگی۔ کوئی خوشی نہیں ہوگی۔''

وکٹر بہت مایوس تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی سچ تھا' تاہم اس نے اسے قبول نہیں کیا۔ ''میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا' درگیش۔ گزشتہ دو سال میری زندگی کا سب سے مسرور عرصہ تھے۔ تمہیں بھلانا میرے لیے آسان نہیں ہے۔''

''میرے لیے بھی تمہیں بھلانا آسان نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ پھر چند منٹ خاموش رہنے کے بعد دوبارہ کہنے لگی: ''میں حاملہ ہوں۔ یہ تمہارا بچہ ہے۔''

چونکہ اس نے اوپر نہیں دیکھا تھا' اس لیے اسے وکٹر کے چہرے پر ابھرنے والے صدمے اور پریشانی کا تاثر دکھائی نہیں دیا۔

جب وہ سنبھلا تو اس نے پوچھا: ''کتنا عرصہ ہوگیا ہے؟''

''میرا خیال ہے ایک مہینہ ہوگیا ہے۔ یہ غلطی تھی' لیکن جو ہوگیا' سو ہوگیا۔''

وکٹر کچھ نہیں بولا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ پھنس گیا ہے۔

''امید ہے تم مجھے اس سے چھٹکارہ پانے کا نہیں کہو گے۔ یہ ہتیا ہوگی۔''

''تو پھر اب ہم کیا کریں؟'' وکٹر نے کہا۔ وہ غصے کو اپنی آواز سے جھلکنے سے روک نہیں سکا تھا۔

''کسی کو علم نہیں ہونا چاہیے۔ نہ تو میں اس کی متحمل ہو سکتی ہوں اور نہ تم۔ ادھر جنوب میں میرے پاس ایک جگہ ہے۔ میں وہاں چند مہینے گزار سکتی ہوں۔ میں بچے کو بھی وہیں چھوڑ سکتی ہوں۔ وہ محفوظ رہے گا اور اس کی بہتر دیکھ بھال کی جائے گی۔ شاید تم بعد میں اسے اپنا سکو۔''

''شاید۔''

وہ دونوں جانتے تھے کہ ایسا ہونا عملاً ممکن نہیں۔

وکٹر پر گہری اداسی طاری ہوگئی۔ اس نے درگیشوری کو کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔

''تم مجھے چند دن دے دو۔ شیرو کو یہیں لے آؤ۔ صرف چند ہفتوں کے لیے۔ مجھے الوداعی تحفہ دے دو۔''

درگیشوری نے اس کی گردن کے گرد بانہیں حمائل کر دیں۔ وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ ان میں سے کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ ان کی غیر معمولی محبت کی داستان کا انجام اس طرح ہوگا۔ ماں درگیشوری اپنی آنکھوں میں آجانے والے آنسوؤں پر حیرت زدہ تھی۔ کچھ دیر بعد وہ وکٹر سے مخاطب ہوئی ''میرا خیال ہے بھارتی کو بتا دینا چاہیے۔ میں خود اسے بتانا پسند کروں گی۔''

☆☆☆
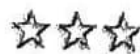
بھارتی کو کافی عرصے سے شک تھا کہ اس کے باپ اور درگیشوری کا رشتہ گرو اور چیلے والا نہیں ہے۔ پہلے تو وہ اس شک کی وجہ سے بہت پریشان ہوئی کیونکہ وہ اپنے پاپا کو انتہائی حد تک اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔ تاہم بعدازاں اس نے اس وجہ

سے صورتحال کو قبول کرلیا کہ درگیشوری نے اس کے باپ کو بہت خوش کر رکھا تھا۔ ادھر وکٹر اپنی طرف سے بہت محتاط تھا کہ اس کی بیٹی پریشان نہ ہو اور ہمیشہ اس کے ساتھ کافی وقت گزارا کرتا تھا تاکہ وہ حسد نہ کرے یا اسے نظرانداز کیے جانے کا احساس نہ ہو۔

ماں درگیشوری نے جس دن وکٹر کو بتایا تھا کہ وہ اس سے رخصت ہو جائے گی، عین اسی دن اس نے بھارتی سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ شام کو بھگوان ٹاورز میں بھارتی کے دفتر گئی۔ اس وقت تک بیشتر ملازمین جا چکے تھے۔ اس نے دفتر میں داخل ہوکر دروازہ بند کر دیا۔ بھارتی اس کے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھی تھی۔

''بھارتی مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' درگیشوری نے بات شروع کی۔ ''میں حاملہ ہوں۔ یہ تمہارے باپ کا بچہ ہے۔''

اس نے کسی ردعمل کے لیے بھارتی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بھارتی اس کی طرف تکتی رہی۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

''بھارتی ہم دونوں ہی بچے کے خواہش مند نہیں تھے۔'' درگیشوری نے بات جاری رکھی۔ ''مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں جیو ہتیا نہیں کرسکتی۔''

''جذباتی اداکاری مت کرو۔'' بھارتی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ ضروری نہیں۔''

''میں تھوڑے عرصے کے لیے یہاں سے جانے کا سوچ رہی ہوں۔ میں بچے کو جنم دے کر اسے وہاں چھوڑ آؤں گی، جہاں اس کی دیکھ بھال ہوسکے گی۔''

بھارتی اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی: ''میں صرف اس بات کی ضمانت چاہتی ہوں کہ میرے باپ کو پتا نہ چلے کہ بچے کو کہاں چھوڑا گیا ہے۔ اخبارات کو

کبھی اس کا پتا نہیں چلنا چاہیے...... کسی کو کبھی بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔ تمہیں مجھ سے پکا وعدہ کرنا ہوگا۔"

ماں درگیشوری نے نرم لہجے میں کہا: "میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔ تمہارا باپ کسی سکینڈل کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ تم فکر نہ کرو۔ تم جانتی ہی ہو کہ مجھے اس سے محبت ہے۔"

ان کی ملاقات اس بات پر اتفاق کے ساتھ ختم ہوئی کہ ماں درگیشوری بمبئی میں شیرو کے ساتھ دو ہفتے گزارنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے آشرم واپس چلی جائے گی۔ بھارتی کا یہ بھی اصرار تھا کہ جتنی جلد ممکن ہو آشرم کو ملک کے کسی دوسرے حصے میں منتقل کرلیا جائے۔ اس نے کہا کہ اس کا سارا خرچ وہ اٹھائے گی۔

چودھواں باب

بمبئی کے رہنے والوں کے لیے جون کی 9 تاریخ بڑی اہم ہوتی ہے۔ اس روز انہیں توقع ہوتی ہے کہ ان کے شہر میں مون سون کا آغاز ہوجائے گا۔ وہ موسم کی صورتحال سے آگاہ ہونے کے لیے بابل ناتھ مندر کے داخلی دروازے کے قریب ویکٹوریہ روڈ پر نصب طوفان پیما کو دیکھتے ہیں۔ لوگ مون سون کی تیاریاں کرلیتے ہیں: چوپاٹی سینڈز پر بھیل پوری اور پھلوں کا جوس بیچنے والے اور پنواڑی اپنے سٹال اور گیس لیمپ اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں۔ چرچ گیٹ کے سرے پر ہاکر فٹ پاتھ پر نمودار ہوجاتے ہیں۔ وہ گم بوٹ اور چھتریاں بیچتے ہیں۔ ناریل بیچنے والے غائب ہوجاتے ہیں ان کی جگہ چنے اور مکئی بیچنے والے لے لیتے ہیں۔ سمندر کا پانی بے چین ہوجاتا ہے۔ مچھلی پکڑنے والی کشتیوں کو محفوظ انداز سے لنگرانداز کردیا جاتا ہے۔ وکٹر کی زندگی میں جو آخری کشتی گم ہوتی' وہ جل بھارتی تھی؛ جس کی گندے خاکستری سمندر میں چاندی جیسی سفید موجودگی لوگوں کو یقین دلاتی تھی کہ مون سون شروع ہونے میں ابھی کچھ وقت ہے۔

سیاہ بادل اچانک جنوب مغربی افق سے نمودار ہوتے ہیں۔ انہیں 3 یا 7 یا 10 جون کو بھی دیکھا جاسکتا ہے' تاہم 9 جون کی تاریخ لوگوں کے ذہنوں پر نقش ہوچکی ہے۔ بادل اپنی آمد کا اعلان بجلی کی چمک اور گرج سے کرسکتے ہیں۔ یا خاموشی سے

سارے آسمان پر چھا سکتے ہیں اور زوردار بارش سے پہلے ہلکی پھوار برسا سکتے ہیں۔ لوگ خوش ہوجاتے ہیں، سمندر اپنی سستی کھو دیتا ہے۔ غصیلی لہریں اٹھتی ہیں اور ساحل کی طرف امڈنے لگتی ہیں۔ سیمنٹ کے ٹرائپوڈ انہیں آگے بڑھنے سے روک دیتے ہیں۔ لہریں ٹرائپوڈز سے ٹکراتی ہیں، ان کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی پھوار میرین ڈرائیور پر سے گزرنے والوں پر گرتی ہے۔ پیدل سیر کرنے والے غائب ہوجاتے ہیں۔ سڑکیں کیچڑ آلود پانی کے دریا بن جاتی ہیں۔ شہر کی تمام گنجان سڑکوں پر ٹریفک رک جاتا ہے۔ بمبئی میں چند دنوں کے لیے زندگی جمود کا شکار ہوجاتی ہے۔

وکٹر ہر سال بمبئی میں مون سون کے ظہور کا انتظار کرتا تھا۔ تاہم مون سون شروع ہوتے ہی وہ مسلسل بارش سے تنگ آجاتا۔ اسے بارش کی وجہ سے اپنے پینٹ ہاؤس میں ٹھہرنا پڑتا تھا۔ یہاں وہ صرف یوگا ہی کرسکتا تھا۔ اسے درگیشوری کے ساتھ محبت کرنے کے لیے ولولہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہی کیفیت بھارتی اور سوامی جی کی ہوتی تھی یعنی یوگا زیادہ لیکن کسی اور شے کی بھوک کم کم۔ شیرو بہت بدمزاج ہوجاتا۔ وہ خوب کھاتا لیکن حرکت بہت کم کرتا اور بہت زیادہ پاد مارتا۔ ماں درگیشوری دن میں دو مرتبہ رین کوٹ پہن کر اسے سیر کرانے لے جاتی۔ وہ باہر جانا پسند نہیں کرتا تھا اور ماں سے التجا کرتا تھا کہ وہ اسے واپس لے جائے۔ واپس آکر وہ صوفے پر لیٹ جاتا اور خراٹے بھرنے لگتا۔

مون سون بمبئی میں زندگی کو کتنا ہی اکتا دینے والے بنا دیتا ہو، وکٹر رات کے کھانے کے بعد میرین ڈرائیو پر پیدل سیر کا معمول تبدیل نہیں کرتا تھا۔ وہ ہلکا رین کوٹ پہنے اور سر پر چھتری تانے چرچ گیٹ تک جاکر واپس آجاتا۔ سڑک پر بہت کم لوگ ہوتے۔ مون سون شروع ہونے کے بعد مراٹھا نوجوان نمودار ہوجاتے۔ انہوں نے ٹخنوں سے گھنگرو باندھے ہوتے۔ وہ ایک دوسرے کی کمر

پکڑے دائرہ بنا لیتے۔ پھر وہ ناچنے لگتے: چھنگ' چھنگ' چھنگ۔ وہ شری گنیش کے تہوار کی تیاری کررہے ہوتے تھے۔ اس تہوار کے موقع پر وہ گن پتی کے رنگین بت اٹھائے گلیوں سے ناچتے ہوئے گزرتے اور پھر ان بتوں کو سمندر میں ڈبو دیتے تاکہ وہ مون سون سے پہلے کی طرح پرسکون ہوجائے۔ جس سال درگیشوری نے وکٹر سے جدا ہونے کا فیصلہ کیا' اس سال مون سون اس کے لیے بالخصوص اداس کردینے والا تھا۔ کالے بادل اور ٹھنڈی ہوا اس میں زبردست آرزو اور بے پناہ اداسی بھر دیتے۔ اسے دوبارہ بڑھاپے کا احساس ہونے لگا۔ انہوں نے محبت نہیں کی۔ اگرچہ وہ چاہتا تھا کہ درگیشوری جانے سے پہلے چند ہفتے اس کے ساتھ گزارے' تاہم اس نے محسوس کیا کہ وہ اس کے دور ہوجانے کے بعد زیادہ ناخوش نہیں ہوگا۔ وہ دن کا وقت دفتر میں یا کار پر شہر میں گھومتے ہوئے گزارتا۔ شام کو وہ اپنے معمول کے مطابق دو جام سکاچ کی بجائے زیادہ پی لیتا اور جلدی سوجاتا۔ اسے مون سون کے ختم ہونے کا انتظار تھا' تاکہ وہ دوبارہ اپنی کشتی پر جاسکے۔

مون سون کی رخصتی اس کی آمد سے زیادہ دھوم دھڑکے سے ہوتی ہے۔ آسمان پر زبردست بادل ہوتے ہیں لیکن وہ پانی سے خالی اور سفید ہوتے ہیں' خاکستری نہیں۔ وہ تیزی سے گزرتے ہیں۔ بجلی چمکتی ہے اور بادل گرجتے ہیں۔ شام کو سورج غروب ہوتا ہے تو بادلوں کو مالٹئی چمک دے دیتا ہے۔ لوگوں کو پتا ہوتا ہے کہ شور تو بہت ہے لیکن بارش اب نہیں ہوگی۔ چوپاٹی سینڈز پر بھیل پوری' پان' پھلوں کا جوس اور آئس کریم بیچنے والے اپنے سٹال دوبارہ لگا لیتے ہیں۔ چرچ گیٹ سٹیشن کے اردگرد سے گم بوٹ اور چھتریاں بیچنے والے غائب ہوجاتے ہیں۔ لہریں ٹرائیوڈز سے ویسے غصے سے ٹکراتی ہیں نہ میرین ڈرائیو پر پھوار برساتی ہیں۔ سمندر میں مچھلیاں پکڑنے والی کشتیاں نمودار ہوجاتی ہیں۔ جل بھارتی بھی دوبارہ نمودار

ہو جاتی ہے اور بمبئی والوں کو اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ اَن داتا۔۔۔ سارے ملک کے ہزاروں گھرانوں کو روزگار دینے والا ۔۔۔ ابھی ان میں موجود ہے۔

اس سال وکٹر اپارٹمنٹ سے نکل کر کشتی پر جانے کو بہت بے تاب تھا۔ وہ روزانہ بندرگاہ کی خبریں حاصل کرتا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ کشتی ٹھیک ٹھاک اور سمندر میں چلنے کے لیے پہلے دن کی طرح تیار ہے تو اس نے ایک مہینے کے لیے کھانے پینے کی اشیا کشتی پر بھجوا دیں۔ اس نے اپنی بیٹی' ماں درگیشوری اور سوامی جی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا کہ وہ کچھ وقت اکیلا گزارنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ اتوار کی شام کو چلا جائے گا۔ وکٹر 5 بجے جے بھگوان ٹاورز سے گیٹ وے آف انڈیا کے لیے روانہ ہوا۔ جل بھارتی گیٹ کی سیڑھیوں کے نیچے گینگ وے کے ساتھ لنگر انداز تھی۔ راستے میں بہت ہجوم تھا۔ وکٹر کو ایسا لگا جیسے سارا بمبئی سڑک پر نکل آیا ہو۔ اس نے ڈرائیور سے کار ایک طرف روکنے کا کہا۔ کشتی تک پیدل جانے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس کی مرسیڈیز بینز کو پہچان لیا۔ جب وہ کار سے اترا تو بہت سے لوگوں نے اسے بھی پہچان لیا۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا: "جے بھگوان کی" اور درجنوں آوازوں نے جواب دیا: "جے۔"

وکٹر نے ان کے نعرے کا جواب دینے کے لیے نیم دلی سے ہاتھ لہرایا۔ وہ وہاں سے دور سمندر میں جانا چاہتا تھا' تاکہ دوبارہ سانس لے سکے۔ وہ گیٹ وے سے چند گز دور تھا کہ گولیاں چلیں۔ لوگ مختلف سمتوں میں بھاگنے اور ایک دوسرے سے ٹکرا کر گرنے لگے۔ اس بھگدڑ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قاتلوں کی کار جائے واردات سے نکل گئی۔ کسی نے اسے روکنے یا اس کا نمبر لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے ڈرائیور کے پہنچنے تک وہ مر چکا تھا اور اپنے خون میں لت پت پڑا تھا۔

❀❀❀

سچ، محبت اور ذرا سا کینہ

مصنف: خوش ونت سنگھ☆ ترجمہ: محمد احسن بٹ☆ قیمت-/280

''بدنام بہت ہے یا وہ مشہور بہت ہے'' یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کبھی اس کی پگڑی دوسروں نے اچھالی اور کبھی اس نے خود اپنے آپ کو سکینڈلائز کیا۔ یہ کتاب بھارت کے سب سے متنازعہ صحافی کا ظاہر و باطن ہے۔ عالمی شہرت یافتہ ادیب، قلمکار اور کالم نگار خوش ونت سنگھ کی اس خودنوشت سوانح عمری کا ہر صفحہ دلچسپ واقعات، چونکا دینے والے انکشافات اور رنگارنگ کیفیات سے عبارت ہے۔

❀❀❀

بھارت کا خاتمہ

خوشونت سنگھ ○ ترجمہ: محمد احسن بٹ -/80

اس عظیم کتاب میں خوشونت سنگھ نے بھارت کی متعصب اور تنگ نظر ہندو قیادت کو مسلمانوں، عیسائیوں اور دیگر اقلیتوں کی قاتل قرار دیتے ہوئے خبردار کیا ہے کہ اگر یہ روش نہ بدلی تو سیکولر بھارت کے خاتمہ کے بعد اب ایسی خوفناک جغرافیائی دراڑیں ابھریں گی جو بھارتی پرچم کے تینوں رنگ چاٹ جائیں گی اور باقی صرف چکر رہ جائے گا......پچھتاوے کا ایک دائمی چکر جو کبھی ختم نہیں ہوگا۔

پاکستان ایکسپریس

خوشونت سنگھ☆ ترجمہ: محمد احسن بٹ -/140

1947ء میں برصغیر کی تقسیم اور اس موقع پر ہونے والے ہولناک فسادات کے حوالے سے سرحد کے دونوں طرف کے ادیبوں نے اردو اور انگریزی زبان میں اپنی قلبی اذیت اور روحانی کرب کا تخلیقی سطح پر اظہار کیا۔ اس حوالے سے خوش ونت سنگھ کا ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' ایک منفرد شناخت کا حامل ہے۔ خوش ونت سنگھ نے اپنے مخصوص غیر جانبدارانہ اور بے باکانہ اسلوب میں اس انتہائی گہرے اثرات کے حامل انسانی المیے کی جو تصویر کشی کی ہے وہ آج کے بدلے ہوئے حالات میں زیادہ بامعنی ہوگئی ہے۔

آزادی (ناول)

خوشونت سنگھ☆ترجمہ:محمد احسن بٹ-/140

یہ تقسیم ہند کے نتیجہ میں قیام پاکستان سے پہلے کا واقعہ ہے، جب ایک وطن فروش گورے آقاؤں کی خوشنودی کے لیے آخری حد تک جانے کو تیار تھا۔ بھارت کے عالمی شہرت یافتہ صحافی اور ادیب خوشونت سنگھ کے کرشماتی قلم نے اس ناول کو آزادی پسندوں اور سامراج دوستوں کی کشمکش کی لفظی تصویر کچھ اس ڈھنگ سے بنایا ہے کہ قاری واقعات کے حسین، رنگین اور سنگین دھارے میں بہتا چلا جاتا ہے۔ بلند پایہ تخلیق کے حسن اور ترجمے کی دلکشی نے قاری کے لیے اس کتاب کا مطالعاتی لطف دوبالا کر دیا ہے۔

❀❀❀

سیاہ یاسمین اور دیگر متنازعہ تحریریں

خوشونت سنگھ ○ ترجمہ:احسن بٹ ☆ قیمت:-/200

عالمی شہرت یافتہ بھارتی صحافی اور ادیب کا قلمی عشرت کدہ۔ وہ تحریریں جنہیں بھارت کا اخلاق باختہ طبقہ بھی برداشت نہ کرسکا۔ وہ افسانے جو حسینوں کی صحبت اور مہ جبینوں کے جھرمٹ میں لکھے گئے۔ یہ وہی تخلیقات ہیں جو خوشونت سنگھ کی شہرت کی وجہ بھی بنیں اور بدنامی کا سبب بھی ٹھہریں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ

خوشونت سنگھ ○ ترجمہ: محمد احسن بٹ-/180

پنجاب کے ایک عالی مرتبہ سیاستدان' بلند پایہ فوجی رہنما اور عظیم حکمران کا زندگی نامہ جس کی بنیاد مستند تاریخی معلومات' معتبر حوالہ جات اور ناقابل تردید شواہد ہیں۔ یہ ممتاز ناول نگار' صحافی اور مؤرخ خوشونت سنگھ کے قلم سے نکلی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وہ داستانِ حیات ہے جو دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ یہ کتاب اگر ایک طرف رنجیت سنگھ کی شخصیت کو بھرپور انداز میں پیش کرتی ہے تو دوسری طرف اسے سلطنت پنجاب کی تشکیل وتوسیع کی مفصل' مدلل اور دلچسپ داستان کا درجہ بھی حاصل ہے۔

❁ ❁ ❁

کمپنی آف وومن

خوشونت سنگھ ○ ترجمہ: محمد احسن بٹ-/160

عصر حاضر میں خوش ونت سنگھ برصغیر کا ایک ایسا ناول نگار ہے جو اپنے قارئین کو مسحور کرنے کے فن سے بخوبی آگاہ ہے اور ''کمپنی آف وومن'' کا ہر صفحہ اس بات کا واضح ثبوت ہے۔ اپنی اس تخلیق میں اس نے ہیرو کو طرح طرح کی عورتوں کے رسیلے ہونٹوں' سیاہ زلفوں اور مست جوانیوں سے کھیلتے دکھایا ہے۔ قاری اصل عبرتناک پہلو تک پہنچنے سے قبل خوب تصوراتی موج میلے کرتا ہے اور پھر اس وقت کانپ کر رہ جاتا ہے جب ہیرو کے ساتھ ساتھ ناول بھی جاں بلب ہوتا ہے۔ یہ خوبصورت' دلکش اور جادوئی تحریر یقیناً خوش ونت سنگھ کے چاہنے والوں اور عام قارئین سے داد پائے گی۔

خوشونت سنگھ

کمپنی
آف وومن

مہاراجہ رنجیت سنگھ

END OF INDIA
بھارت کا
خاتمہ

آزادی